
CONFIDENTIAL
MEDICAL
MAFIA

بسم اللہ الرحمن الرحیم

DNA
ڈی این اے

نور راجپوت





رتق

حصہ دوم

ہر سچ کی ایک ابتدا ہوتی ہے۔مگر بعض ابتدائیں اتنی خاموش ہوتی ہیں کہ اس وقت کسی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ آنے والے برسوں میں یہی لمحہ کتنی زندگیاں نگل لے گا۔بعد میں جب لوگ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ حادثہ اس دن نہیں ہوا تھا...حادثہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔بس اس کی آواز دیر سے سنائی دی۔

آئی سی یو میں ہونے والا وہ نکاح ایک انجام نہیں تھا...وہ تو ایک ایسے سفر کی پہلی منزل تھی،جس کی راہ میں خون،خاموشیاں،غلط فیصلے اور ٹوٹے ہوئے لوگ بکھرے پڑے تھے۔

اس سفر کی پہلی اینٹ...

آج سے کئی برس پہلے رکھی گئی تھی۔

اور شاید اگر اُس دن صرف ایک شخص بھی خاموش نہ رہتا...

تو آج کسی کو اپنی محبت،اپنی عزت اور اپنی زندگی کی قیمت یوں ادا نہ کرنی پڑتی۔

وقت نے ایک طویل سانس لی۔

حال کی تمام آوازیں،ہسپتال کا حبس اور بیپ کی دھنیں دھند میں گم ہو گئیں۔

اور ماضی نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

گیارہ برس پہلے...

گیارہ سال پہلے کا بزدار پیلس اتنا بوجھل نہیں تھا مگر اس کی دیواروں میں پھیلی ہوئی آن بان آج بھی وہی تھی۔بائیں جانب والے پیلس کی پہلی منزل پر واقع ایک کشادہ کمرے میں دھوپ کی کھلی سنہری کرنیں شیشے کی بڑی کھڑکیوں سے چھن کر اندر آ رہی تھیں۔کمرے کے وسط میں رکھی بڑی سی اسٹڈی ٹیبل پر اینا ٹمی اور فزیالوجی کے بھاری بھرکم رجسٹرز،رنگ برنگے ہائی لائٹرز اور نوٹس کا ایک طوفان بکھرا ہوا تھا۔وہاں دو جڑواں بہنیں بیٹھی تھیں۔نجف بزدار اور نشاط بزدار۔ایم بی بی ایس کی دوسرے سال کی طلبہ،ایک ہی بیچ،ایک ہی کلاس اور ایک ہی دن پیدا ہونے والیں مگر مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

"نشاط!خدا کے لیے جلدی کرو... پندرہ منٹ میں اگر ہم نے یہ ٹاپکس ختم نہ کیے تو ہم لیٹ ہو جائیں گے۔میچ کا ٹائم ہونے والا ہے۔"

نجف نے اپنے بکھرے بالوں کو پونی ٹیل میں کس کر باندھتے ہوئے،اپنے سامنے کھلے رجسٹر پر ہائی لائٹر چلاتے ہوئے تیزی سے کہا۔اس

کی آنکھوں میں شاداب چمک تھی اوراس کا سارادھیان اس بات پر تھا کہ کسی طرح وہ اپنے نوٹس مکمل کر کے اسٹیڈیم کی طرف نکل سکیں۔ نشاط نے چہرے پر حد درجہ بیزاری پھیلا کر اپنی اینا ٹمی کی موٹی کتاب دھپ سے بند کر کے میز پر پٹخ دی۔

"یار مجھ سے نہیں پڑھا جاتا یہ سب! سچ میں نجف، شدید سر درد ہو رہا ہے... یہ میڈیکل سائنس اور انسان کے اندر کی ہڈیاں، رگیں اور بیماریاں یاد کرتے کرتے میری روح فنا ہو چکی ہے۔" نشاط نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرائے اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر منہ بسور لیا۔

"نشاط! پلیز...ڈرامے مت کرو!" نجف نے اسے گھورا، "اگر آج کا ٹاپک رہ گیا تو پروفیسر شاہد نے کل کلاس سے باہر نکال دینا ہے اور ویسے بھی، سقراط کا میچ شروع ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔ اگر ہم وقت پر نہ پہنچے تو ساری فرنٹ سیٹس بھر جائیں گی۔"

"سقراط...سقراط...سقراط!" نشاط نے بڑبڑا کر آنکھیں گھمائیں، "تمہیں صرف سقراط کے میچ کی فکر ہے اور مُجھے اپنی برباد ہوتی زندگی کھائے جا رہی ہے۔" وہ کراہ کر بولی۔ اسی لمحے کمرے کا بھاری دروازہ دھکیلا گیا اور ملازمہ شیبا ایک چمچماتی ہوئی فوڈ ٹرالی اندر دھکیلتے ہوئے داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ہی نیلوفر بیگم نہایت سلیقے اور وقار کے ساتھ کمرے میں آئیں۔ ٹرالی پر تازہ سٹرابیری جوس کے دو گلاس، بادام، اخروٹ اور ہلکی پھلکی غذا سے سجائے گئے سنیکس رکھے تھے۔ وہ خاص ڈائیٹ جو پڑھائی کے دباؤ کے دوران نیلوفر بیگم خود اپنی بیٹیوں کے لیے تیار کرواتی تھیں۔ انہیں اپنی دونوں بیٹیاں بے حد عزیز تھیں، وہ ان کی ذرا سی تھکن بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

" کیا ہو رہا ہے بھئی؟ باہر تک تم دونوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ سب ٹھیک ہے؟" ساڑھی کا پلو سنبھالتے انہوں نے گہری نظریں دونوں پہ ڈالتے ہوئے پوچھا اور ٹرالی سے جوس کا گلاس اٹھا کر نشاط کے سامنے رکھا۔

"مام! اسے کہیں نا جلدی کرے..." نجف نے فوراً نیلوفر بیگم کا بازو تھام کر التجا کی۔ شہد رنگ گھنے بال اور ہم رنگ آنکھیں...ان آنکھوں میں چمک ہی چمک تھی۔ نیلوفر بیگم کبھی کبھی ان آنکھوں کو دیکھ کر ٹھٹک جاتی تھی۔ وہ ذہانت سے لبریز آنکھیں تھیں۔ حالانکہ نجف کے نین نقوش نشاط اور نیلوفر بیگم جیسے تیکھے نہیں تھے مگر اسکے چہرے پر ایک سادہ سا تاثر رہتا تھا جو اسے نشاط سے جدا کرتا تھا۔

"یہ پڑھائی کے نام پر نخرے دکھا رہی ہے حالانکہ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ٹاپک ختم کر کے ہی باہر جائیں گے۔"

نیلوفر بیگم نے اپنے ہاتھوں کو سینے پر رکھ کر نجف اور نشاط کو تنقیدی نظروں سے دیکھا۔

" کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں بھی جانے کی۔خاموشی سے بیٹھ کر اپنی پڑھائی مکمل کرو۔"

"پلیز مام..." یہ سنتے ہی نجف اور نشاط، دونوں بیک وقت چلا اٹھیں۔وہ اس بڑے سے محل میں مزید قید ہو کر نہیں رہ سکتی تھیں۔

" کوئی پلیز نہیں...امجد صاحب کو پتا چلا کہ تم دونوں پڑھائی چھوڑ کر کوئی فضول میچ دیکھنے جا رہی ہو،تو وہ سخت ناراض ہوں گے۔"

" آخر ہم پر اتنی پابندیاں کیوں مام؟ کیا ہم عام لڑکیوں کی طرح نہیں جی سکتیں؟" نجف کے چہرے کی چمک بجھ گئی۔وہ یاسیت سے اپنی ماں کو دیکھنے لگی جو امجد بزدار سے عمر میں کئی ہند سے چھوٹی تھی۔ایک گلوکارہ تھی مگر انہوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر امجد بزدار کی شریک حیات کے خاکے میں ڈھال لیا تھا۔

" کیونکہ تم عام لڑکیاں نہیں ہو۔تم امجد بزدار کی بیٹیاں ہو۔مستقل کی ڈاکٹرز..."

"ڈاکٹر...؟" نشاط نے گھٹتے ہوئے لہجے میں ان کی بات کاٹی اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی، "مُجھے ڈاکٹر نہیں بننا۔آپ کو پتا ہے، مُجھے اس میڈیکل سائنس سے کتنی کوفت ہوتی ہے؟ میرا خواب کچھ اور ہے...مم...میں...میں اسکرین پر جانا چاہتی ہوں۔"

یہ سنتے نیلوفر بیگم کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے سخت ناگواری ابھری۔انہوں نے سختی سے نشاط کے شانے کو دبوچا اور اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

"اس بیوقوفانہ شوق کو اپنے ذہن سے نکال دو۔" ان کا لہجہ کٹھور ہو گیا، "اس خاندان میں کسی کو اپنا من پسند یا کوئی گھٹیا پروفیشن چننے کی اجازت نہیں ہے۔اس خاندان کی لڑکیاں یا تو عزت کے ساتھ گھر سنبھالتی ہیں یا پھر ڈاکٹر اور پروفیسرز بنتی ہیں۔اسکرین اور ایکٹنگ کی باتیں اگر دوبارہ تمہاری زبان پر آئیں تو تمہیں تمہارے باپ سے کوئی معافی نہیں ملے گی۔"

کمرے میں سکتہ چھا گیا۔نشاط نے اپنے لب بھینچ لیے۔اس کی آنکھوں میں بغاوت اور محرومی کے چنگارے چمک رہے تھے مگر باپ کے

نام کا خوف ایسا تھا کہ وہ مزید کچھ نہ بول سکی۔خاموشی سے واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئی اور شربت کا گلاس گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔نجف نے نشاط کا ہاتھ میز کے نیچے سے پکڑ کر دبایا۔وہ اسے پرسکون رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

"جلدی سے اپنا کام ختم کرو...آج رات میری کچھ سہیلیاں آ رہی ہیں۔ان کی موجودگی میں تم دونوں کو گھر ہی رہنا ہوگا۔"وہ حکمیہ کہتی پلٹ گئیں۔پیچھے شیبا ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔وہ ایسے کھڑی تھی جیسے وہاں موجود ہیں نہ ہو۔

"دھیان رکھنا شیبا..."وہ شیبا کو اشارہ کرتے کمرے سے باہر نکل گئیں جبکہ پیچھے سناٹا چھا گیا۔بزدار پیلس کی اس شاہانہ فضا کے پیچھے... پابندیوں اور ان دیکھے خوابوں کا ایک ایسا جال بننا شروع ہو چکا تھا،جس کی ہولناک قیمت ان دونوں بہنوں کو آنے والی زندگی میں چکانی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟"دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ویٹ میں کچھ کرتی ہوں..."نجف نے میز پہ دھرا فوراً اپنا فون اٹھایا۔اسکے انگوٹھے اسکرین پہ تیزی سے پھسل رہے تھے۔پلکیں دھیرے سے لرز رہی تھیں۔وہ ایک میسج ٹائپ کر رہی تھی اور پھر سینڈ کا بٹن دبا تھا۔گہری سانس لیتی فون واپس مزہ پر رکھ دیا۔

"الفا ہے نا..."وہ جانتی تھی۔حق کے پاس کوئی نہ کوئی جگاڑ ہوگا۔اسکے بیسٹ فرینڈ کا میچ تھا۔وہ جائے گا اور انہیں بھی لے جائے گا۔وہ دونوں تیز ہوتی تنفس کے ساتھ میز پر دھرے فون کی اسکرین کو گھور رہی تھیں۔ایک...دو...تین!اور پھر فون کی اسکرین جل اٹھی۔نجف نے جھٹکے سے فون اٹھایا۔

"آئی ایم کمنگ!(میں آ رہا ہوں)"اسکرین پہ صرف تین الفاظ تھے اور یہ تین الفاظ ان کے لیے کسی آزادی سے کم نہ تھے۔"یس..."وہ دونوں بیک وقت دبا دبا چلا اٹھیں اور پھر شیبا کو دیکھا۔شیبا نے فوراً پہلی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ہونٹوں کی زپ بند کر لی۔اسے نجف اور نشاط دونوں عزیز تھیں۔ان دونوں کے چہرے ایک بار پھر سے کھل اٹھے تھے۔

☆...☆...☆

ہاکی اسٹیڈیم شائقین کے شور، تالیوں اور نعروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آج اسٹیٹ لیول کا یہ فائنل ہاکی میچ تھا اور فضا میں جوش وخروش کا طوفان برپا تھا۔ تقریباً تئیس سالہ سقراط شبگیر، اپنی ہاکی ٹیم کی رسمی یونیفارم، کٹ اور شن گارڈز پہنے، ہرے بھرے ایسٹروٹرف گراؤنڈ کے وسط میں موجود تھا۔ اس کے بال گردن کے پیچھے آدھے جوڑے میں بندھے ہوئے تھے اور ہاتھ میں تھامی ہاکی اسٹک پر اس کی گرفت بار بار مضبوط اور ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کا دھیان نہ تو کوچ کی آخری سٹریٹجی پر تھا اور نہ ہی ٹیم کے دیگر کھلاڑیوں پر، جو اسے گھیر کر پاسنگ اور گول اٹیک کے گر سمجھا رہے تھے۔ اس کی نگاہیں بے چینی سے اسٹیڈیم کی بالائی سمت میں، وی آئی پی اور سپیشل انکلوژر کی خالی نشستوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ کسی کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ اس کا پورا وجود دو نیلی آنکھوں کو وہاں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے سراہتی ہوئی وہ دو ذہین آنکھیں۔ میچ شروع ہونے میں اب محض چند منٹ باقی تھے۔ سقراط اپنی ٹیم کا کیپٹن تھا، اسے ٹاس کے لیے نکلنا تھا اور اپنے اعصاب کو مکمل طور پر قابو میں رکھنا تھا مگر اس کا دل سینے میں بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک لمبا، گہرا سانس لیا اور اپنی بے چینی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ اس کے اندر کچھ چیخ رہا تھا۔ وہ بڑے لوگ... وہ بزدار خاندان کے افراد، اس جیسے عام سے ہاکی پلیئر کے میچ کے لیے بھلا کیوں آئیں گے؟ گہری مایوسی نے اس کے چہرے کو گھیر لیا۔ اس نے ایک کڑوا سانس کھینچا، اپنا رخ موڑا اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ واپس اپنی ٹیم کے ڈگ آؤٹ کی طرف پلٹنے لگا۔

"سقراط..." ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ اسٹیڈیم کے اس مخصوص انکلوژر سے ایک تیز آواز ابھری۔ سقراط نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور پھر اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت کی شاداب لہر پھیل گئی۔ انکلوژر کے جنگلے کے بالکل پاس حق کھڑا تھا۔ سفید ٹراؤزر اور نیلی ٹی شرٹ میں ملبوس، اسی کا ہم عمر حق بزدار اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے دیوانہ وار ہلا رہا تھا اور سقراط کا نام پکار رہا تھا۔ سقراط کے لبوں پر بے ساختہ کھلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس کے سینے میں اٹکی ہوئی سانس جیسے یکلخت آزاد ہو گئی اور پھیپھڑے جیسے تازہ آکسیجن سے بھر گئے۔ اور پھر... اس کی نظر حق کے بالکل برابر میں کھڑی نجف پر پڑی۔ وہ زرد رنگ کے سادہ سے سوٹ میں ملبوس، ہوا میں اڑتے بالوں کو سنبھالتی ہوئی، اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک بڑا سا نیلے رنگ کا چارٹ بینر لیے کھڑی تھی۔ اس بینر پر موٹے چمکدار الفاظ میں لکھا تھا۔

" کیپٹن سقراط... یو آر اور ہیرو!"

نجف کے چہرے پر جوش اور خوشی کی مسکراہٹ تھی جو سقراط کے دل کے پار اتر گئی۔ اس کے پاس ہی نشاط بھی کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی مگر سقراط کی دنیا اس لمحے صرف اس نیلے بینر اور اس کے پیچھے کھڑی لڑکی پر آ کر تھم گئی تھی۔

کیپٹن سقراط شبگیر ....جس کے اعصاب چند لمحے پہلے تک چیخ رہے تھے، جو مایوسی کے گہرے اندھیروں میں اتر رہا تھا اب اسٹینڈز کی طرف دیکھ کر کھل کر ہنس دیا۔اس کی ہنسی میں جیت کا یقین سمٹ آیا تھا۔اس نے اپنی ہاکی اسٹک فضا میں لہرائی،حق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک محکم اشارہ کیا اور پھر ٹرف گراؤنڈ کی طرف پلٹ گیا۔

☆...☆...☆

سٹیل کی سیٹی کی تیز آواز کے ساتھ ہی اسٹیٹ ہاکی فائنل کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔
ایسٹروٹرف پر گیند کی رفتار، ہاکی اسٹکس کے ٹکرانے کی سخت آوازیں اور شائقین کا شور فضا کو گرما رہا تھا۔مقابل ٹیم حد درجہ تجربے کار اور آکرامک تھی۔انہوں نے شروع ہی سے سقراط کی ٹیم پر شدید دباؤ بنا رکھا تھا اور زبردست ٹف ٹائم دے رہی تھی۔سقراط جو سنٹر فارورڈ کے اہم ترین پوزیشن پر کھیل رہا تھا،اب شدید اعصابی تناؤ کا شکار نظر آتا تھا۔پہلے ہاف کے وسط میں جب کھیل کو تھوڑی دیر کے لیے روکا گیا اور ہاف ٹائم بریک کا سائرن بجا تو کھلاڑی پسینے میں شرابور اپنے اپنے ڈگ آؤٹ کی طرف بڑھے۔سقراط نے اپنے بکھرتے بالوں کو سمیٹا، اپنی ہاکی اسٹک کو ایک ہاتھ میں تھاما اور گراؤنڈ کی سائیڈ لائن کے پاس آکر پانی کی بوتل اٹھائی۔اسی لمحے حق جنگلے کو پار کرتا ہوا، تیز قدموں سے سیدھا سقراط کے پاس چلا آیا۔وہ ایک سادہ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں تھا۔اسکا لباس سادہ مگر مہنگا تھا۔وہاں موجود کئی لڑکیوں نے کئی بار اسے دیکھا تھا مگر وہ بھنویں سکیڑے فیلڈ میں کھلتے سقراط کو دیکھ رہا تھا۔اس کی نظریں پورے ہاف میں سقراط کی موومنٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے سقراط کے شانے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا اور اس کی سرخ ہوتی آنکھوں میں دیکھا۔

"سقراط!تم شدید اسٹریس میں کھیل رہے ہو اور اسی وجہ سے تم ڈی (D) کے پاس بار بار غلط ٹیکل کر رہے ہو۔تم اپنے نارمل گیم سے ہٹ رہے ہو۔"

سقراط نے پانی کا گھونٹ بھرا،اپنا سانس بحال کیا اور شدید حیرت سے حق کو دیکھا۔اس کا ایک ابرو بے ساختہ اوپر اٹھ گیا۔

"تمہیں ہاکی کی اتنی باریک نالج کب سے آ گئی؟"سقراط نے اپنے گہرے سانسوں کے درمیان تعجب سے پوچھا۔حق کے چہرے پر ہلکی، پُر اعتماد سی مسکراہٹ ابھری۔

"تمہارے ساتھ رہ رہ کر..."

سقراط اپنے سینے میں پھیلا ہوا تناؤ باہر نکالنے کے لیے ایک لمبا، گہرا سانس لیتے ہوئے خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"وہ واقعی ٹف ٹائم دے رہے ہیں..." سقراط نے اپنی ہاکی اسٹک کی گرپ کو کستے ہوئے کڑواہٹ سے کہا، "اور صرف ٹف ٹائم نہیں دے رہے، وہ حد درجہ بدتمیزی اور بے ایمانی پر اتر آئے ہیں۔ ریفری کی نظر بچتے ہی وہ بال کے بجائے کھلاڑیوں کی ٹانگوں اور اینکلز پر ہٹ کر رہے ہیں۔ میرے دو فارورڈز کو وہ الیگل باڈی بلاک سے انجرڈ کر چکے ہیں۔"

حق کے چہرے کے تاثرات فوراً سخت ہو گئے۔ اس نے گراؤنڈ کی دوسری طرف موجود مخالف ٹیم کو گھورا اور پھر واپس سقراط کی طرف مڑا۔

"اگر وہ کھیل کے اصول بھول رہے ہیں تو تم بھی شرافت کا ڈھونگ بند کرو۔ فارورڈ پاس لو اور سیدھا اٹیک کرو۔ پسلیاں توڑ دو سالوں کی!"

حق کے اس جارحانہ مشورے پر سقراط بے ساختہ ہنس دیا۔ حق کافی سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ سقراط کا سارا تناؤ ایک لمحے میں زائل سا ہو گیا۔ اس نے حق کے شانے پر تھپکی دی، اپنے چہرے پر خطرناک کیپٹن والا تاثر سجایا اور اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ حق بھی واپس پلٹا اور واپس وی آئی پی انکلوژر کی طرف بڑھ گیا جہاں نشاط اور نجف بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ حق جیسے ہی ان کے قریب پہنچا، نجف دو قدم آگے بڑھی۔ اس کے چہرہ پر بے چینی دکھائی دیتی تھی۔

"سب ٹھیک ہے نا؟ وہ اتنی بے ایمانی کیوں کر رہے ہیں؟ کیا... کیا وہ لوگ جیت جائیں گے؟" نجف کی آواز میں خدشات کا طوفان تھا۔ حق نے نجف کی اس سراسیمگی کو دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔

"نہیں... سقراط کو جیتنا ہوگا۔" اس کی آنکھیں چمکتی ہوئی تھیں، اسکا لہجہ حتمی تھا۔ وہ ایک بازو سینے پر باندھے، اس پر دوسرے بازو کی کہنی ٹکائے اپنی ٹھوڑی کھجا رہا تھا۔ میچ پھر سے شروع ہو چکا تھا اور اس بار دونوں ٹیمیں پہلے سے زیادہ جارحانہ تھیں۔
اور حق کی بات غلط نہیں تھی۔ دوسرے ہاف کا سائرن بجتے ہی گراؤنڈ کا منظر بالکل بدل چکا تھا۔ سقراط شبگیر اب جارحانہ روپ میں ٹرف پر اترا تھا۔ اس کے ہر ٹیکل میں کمال کا پرفیکشن تھی۔ اس نے مخالف ٹیم کی بے ایمانی کا جواب گیند کی ایسی ڈریبلنگ سے دیا کہ مخالف دفاعی کھلاڑی صرف ہوا کو تکتے رہ گئے۔ سقراط کی ٹیم کے تین مسلسل پرفیکٹ ٹیکلز اور سنٹرل پاسنگ نے مخالف ٹیم کے سٹرکچر کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ کھیل کے آخری منٹوں میں سقراط نے ڈی کے بالکل کنارے سے ایسا ریورس فلک مارا کہ ہاکی بال ہوا کو چیرتی ہوئی سیدھی مخالف ٹیم کے

گول نیٹ کے اندر جا گھسی۔ سائرن بجا اور وہ لوگ واقعی یہ فائنل میچ جیت گئے۔ اسٹیڈیم نعروں اور تالیوں کی گونج سے گونج اٹھا۔ گراؤنڈ میں سقراط کی ٹیم کے کھلاڑی ایک دوسرے پر گر رہے تھے جبکہ انکلوژر میں کھڑی نجف نے خوشی کے مارے اپنا نیلے رنگ کا بینر ہوا میں لہرایا، حق کی جیب میں رکھا فون بار بار بج رہا تھا۔ وہ فون اٹھائے وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ ایسٹروٹرف پر جیت کا جشن پورے جوبن پر تھا۔ سقراط کے ساتھی کھلاڑیوں نے نعرے لگاتے ہوئے اسے اپنے شانوں پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ ہوا میں ہاکی اسٹک لہراتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی خوشی میں شریک تھا کہ یکلخت اس کی نظر اسٹیڈیم سے گراؤنڈ کی طرف آتی نجف پر پڑی۔ وہ ہجوم کو چیرتی ہوئی اسی کی طرف آ رہی تھی۔ بالوں کو اب ڈھیلی پونی میں باندھے، ہاتھ میں وہی نیلا بینر تھامے، اس کا چہرہ خوشی اور فتح کی چمک سے دہک رہا تھا۔ سقراط کا دل ایک لمحے کو دھڑکنا بھول گیا۔ اس کا سارا کیپٹن والا رعب ہوا میں اڑ گیا۔

"ابے چھوڑو... چھوڑو مُجھے!" سقراط اپنے ساتھیوں کے شانوں پر کلملا اٹھا اور زبردستی خود کو ان کی گرفت سے چھڑوانے لگا۔ اس کے کھلاڑی ساتھیوں نے تھوڑی حیرت سے دیکھا پھر ان کی نظر سامنے سے آتی نجف پر پڑی۔ لڑکوں کی آنکھوں میں فوراً شرارتی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"سمجھ گئے کیپٹن!" انہوں نے سقراط کو فوراً نیچے اتار دیا۔ سقراط نے بے ساختہ اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنے الجھے ہوئے بالوں کے جوڑے کو درست کیا، اپنی ہیڈ بینڈ سیدھی کی اور یونیفارم کی آستین سے اپنے پسینے سے تر چہرے کو جلدی جلدی صاف کیا۔ اس کا چہرہ شدتِ خفت اور جوش سے بالکل سرخ پڑ چکا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی دہک تھی... آج اگر وہ یہ فائنل میچ ہار جاتا تو نجف کے سامنے اس کی ایسی بھیانک بے عزتی ہوتی کہ وہ کبھی خود کو معاف نہ کر پاتا۔ وہ اسکے سامنے ہار نہیں سکتا تھا۔ نجف بالکل اس کے سامنے آ کر رکی۔ اس کا تنفس تیز چل رہا تھا اور چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

"مبارک ہو کیپٹن سقراط شبگیر!" نجف نے اپنا نیلا بینر اس کے سامنے تھوڑا سا لہرایا، "میں نے کہا تھا نا تم جیتو گے۔ واؤ سقراط، تم نے واقعی کمال کر دیا۔"

سقراط نے اپنے سرخ پڑتے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔ وہ نجف کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"شکریہ..." سقراط کی آواز میں ہلکی سی لرزش آئی، اس نے اپنی آستین سے کنپٹی کا پسینہ صاف کرتے ہوئے مسکرا کر کہا، "اگر آج نہ جیتتا... تو بھاری بے عزتی ہوتی۔"

نجف بے ساختہ ہنس دی۔ "تم ہار بھی جاتے تو ہمارے لیے ہیرو ہی رہتے ،مگر سچ کہوں...تمہارے آخری تین ٹیکلز اتنے پرفیکٹ تھے کہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔"

سقراط نے خاموشی سے اس کی تعریف کو اپنے اندر جذب کیا۔اس نے گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا،حق اور نشاط اس ہجوم میں نہ جانے کہاں غائب ہو چکے تھے۔پھر اس نے چہرہ سیدھے کیے نجف کو دیکھنے کی جرأت کی۔ اس لمحے پورے اسٹیڈیم کا شور،لوگوں کے نعرے اور ساتھیوں کے قہقہے مدہم پڑ گئے تھے۔سقراط کے لیے کائنات کا مرکز صرف وہ زرد لباس والی لڑکی اور اس کی مسکراہٹ بن چکی تھی۔اس سے پہلے ان میں سے کوئی کچھ کہتا،لاؤڈ سپیکر پر کمنٹیٹر کی بھاری آواز گونجی۔کیپٹن کو ٹرافی کے لیے بلایا جا رہا تھا۔ اسٹیڈیم ایک بار پھر نعروں سے گونج اٹھا۔سقراط نے ایک گہرا اور لمبا سانس لیا۔اس نے نجف کی طرف دیکھا،جس کی آنکھوں میں سقراط کے لیے بے پناہ فخر اور خوشی چمک رہی تھی۔

"جاؤ کیپٹن!اپنی ٹرافی لو!" نجف نے مسکرا کر کہا تو سقراط سر اثبات میں ہلا کر اپنی ٹیم کی جانب بڑھ گیا۔اس کے قدم جیسے ہوا میں اٹھ رہے تھے۔وہ اپنی پوری زندگی میں آج تک اتنا خوش کبھی نہیں ہوا تھا۔وہ ایک عام سا،محنت کش خاندان کا لڑکا تھا مگر آج...آج شہر کے سب سے جانے مانے خاندان کے لوگ،اسے سپورٹ کرنے کے لیے اسٹیڈیم آئے تھے۔ اسے لگا جیسے اس نے صرف ہاکی کی ٹرافی نہیں جیتی بلکہ دنیا کی سب سے قیمتی خوشی اپنے نام کر لی ہے۔وہ پُر اعتماد اور مضبوط قدم اٹھاتا ہوا سٹیج کی طرف بڑھ گیا۔نجف وہیں کھڑی اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔وہ سقراط کے لیے دل سے خوش تھی۔

☆...☆...☆

یہ اسی رات کی بات تھی۔باکسنگ کلب کے ہال میں شائقین کی چیخ و پکار اور چمڑے کے دستانوں کے ٹکرانے کا شور گونج رہا تھا۔رنگ میں دو باکسر ایک دوسرے پر تابڑ توڑ وار کر رہے تھے اور باہر شائقین کا جوش عروج پر تھا۔حق نے ابھی حال ہی میں ایم بی بی ایس کی ڈگری مکمل کی تھی۔اب وہ ہاؤس جاب کر رہا تھا۔اس وقت وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھا رنگ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔حق طبعاً کم گو تھا مگر اس کے پرسکون وجود کے اندر باکسنگ کا ایک ان دیکھا جنون بسا ہوا تھا۔سقراط کے میچ جیتنی کی خوشی میں،حق بالخصوص اسے اس باکسنگ کلب میں لایا تھا کیونکہ وہ اس فتح کا جشن اپنی من پسند جگہ منانا چاہتا تھا۔سقراط اب یونیفارم بدل کر سادہ سی جینز اور شرٹ میں ملبوس تھا۔حق کے مقابلے میں اس کے کپڑے کسی مہنگے برانڈ کے نہیں تھے۔وہ سادہ اور عام سے تھے مگر حق کو اس برانڈ ڈفرق سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بالکل شفاف تھے۔سقراط نے ہاتھ میں پکڑی کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرا اور رنگ میں لڑتے باکسرز کو دیکھتے ہوئے حق کی

طرف رخ کیا۔

"مُجھے آج تک سمجھ نہیں آتی حق...اگر تمہیں باکسنگ اتنی پسند ہے تو پھر تم ڈاکٹر کیوں بنے ہو؟"

حق کے لبوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ ابھری، مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں ایک سال پہلے ملے تھے۔ جوان ہونے کے بعد باقاعدہ ایک سال پہلے ملے تھے اور بچپن؟ بچپن کے قصے پھر سہی! بزدار سپورٹس کالج کے اس یادگار ٹورنامنٹ میں، جہاں سقراط اپنی ٹیم کے ساتھ کھیلنے آیا تھا۔ اگرچہ وہ خاندانی رشتوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے ہمیشہ سے واقف تھے مگر بچپن کے بعد ان کی باقاعدہ ملاقات بالکل غیر متوقع اور طوفانی تھی۔ اس رات کھیل کا وہ وسیع و عریض میدان اس وقت زبردست طوفان کی گرفت میں تھا۔ آسمان پر کالی، خوفناک گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور تیز، موسلا دھار بارش میں پورا گراؤنڈ جل تھل ہو چکا تھا۔ اس طوفانی بارش کے درمیان حق بزدار کیچڑ زدہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کا سانس بری طرح اکھڑ رہا تھا، اس کا سینہ بے ترتیبی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا اور وہ شدید درد سے تڑپ رہا تھا۔ اس کا مہنگا سوٹ کیچڑ میں لت پت ہو چکا تھا۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔ وہ ہجوم سے دور تھا اور شور اس قدر تھا کہ اسکی آواز کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسی اثنا میں ریسٹ روم جانے کے بعد سقراط وہاں سے گزر رہا تھا۔ زمین پر تڑپتے لڑکے کو دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ سقراط نے اپنی ہاکی اسٹک ایک طرف پھینکی اور زمین پر پڑے حق کے گال کو ہلکے سے تھپتھپایا۔ قریب آنے پر وہ اسے پہچان گیا تھا۔

"ہیلو! تم ٹھیک ہو؟"

زمین پر پڑا وہ نیلی آنکھوں والا حق اپنے سینے پر ہاتھ رکھے تیزی سے، تکلیف سے سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ درد کی شدت سے زرد ہو چکا تھا۔

"میری میڈیسن...میری میڈیسن...." حق نے بمشکل اپنے خشک، لرزتے لبوں سے لفظ آزاد کیے۔ سقراط نے فوراً اپنے گرد نظریں دوڑائیں۔ حق سے چند فاصلے پر، کیچڑ میں ایک سفید رنگ کی چھوٹی سی شیشی پڑی تھی جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری تھی۔ سقراط نے بغیر ایک سیکنڈ ضائع کیے وہ دوا اٹھائی، حق کے سر کو اپنی گود میں رکھا اور شیشی سے چند گولیاں نکال کر فوراً اس کے منہ میں انڈیل دیں۔ دوا نگلتے ہی، چند سیکنڈز تک حق کی حالت ویسے ہی رہی۔ اس کا سر سقراط کی گود میں تھا اور طوفانی بارش کا پانی ان دونوں پر مسلسل برس رہا تھا۔ سقراط حق کو پہچانتا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے کوئی شدید میڈیکل کنڈیشن تھی اور اس وقت یہ دوا اس کی زندگی کے لیے کتنی ناگزیر تھی۔ تقریباً سات طویل اور دردناک منٹوں بعد، حق کا سانس بحال ہونا شروع ہوا۔ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑے اور وہ اٹھنے کے قابل ہوا۔ اس نے ایک

جھٹکے سے خود کو سقراط کی گود سے الگ کیا۔اسکا چہرہ سپاٹ ہو چکا تھا۔

"تھینک یو..." اس کی آواز میں نقاہت تھی مگر آنکھوں میں ایک عجیب سا کٹھور جمود تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" سقراط نے فکرمندی سے اس کے زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
حق نے دوبارہ سر ہلایا مگر اس کی نظریں فوراً دائیں جانب کھڑی عمارت کی دوسری منزل کی روشن کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔وہاں...عمارت کی بالکونی میں چند لمحات پہلے شمس بزدار کھڑا تھا۔اسکا چچا ڈاکٹر شمس بزدار! کرب کے آثار حق کے چہرے پر ابھرے۔وہ کچھ نہیں بھولتا تھا۔ وہ زمین پر تڑپ رہا تھا،اس کا سانس بند ہو رہا تھا اور اس کا اپنا چچا اوپر کھڑا خاموشی سے اس کا تماشا دیکھتا رہا، جواب وہاں سے جا چکا تھا۔ حق کے سینے کے مقام پر چھبن کا احساس ہوا مگر اگلے ہی پل اس کا چہرہ بالکل سپاٹ، پتھر کی طرح سخت اور بے حس ہو گیا۔اس نے اپنے اندر کے اس زخم کو ہمیشہ کے لیے ذہن میں محفوظ کر لیا۔سقراط بھی زمین سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے حق کی طرف اپنا مضبوط ہاتھ بڑھایا۔ حق نے ایک گہرا اور لمبا سانس لیا۔اس نے سر اٹھا کر سقراط کو دیکھا،جس کے گھنے بالوں سے بارش کے قطرے ٹپک رہے تھے...وہی قطرے جو نیچے جھکے حق کے چہرے اور آنکھوں پر بھی گر رہے تھے۔حق نے اپنے ہونٹ بھینچے،ایک نظر اپنے سامنے کھڑے اس لڑکے کو دیکھا اور پھر اپنا ہاتھ سقراط کی پھیلائی ہوئی ہتھیلی میں دے دیا۔دو ہاتھ آپس میں ملے...اور ٹھیک اسی لمحے،آسمان کو چیرتی ہوئی بجلی شدید دھماکے کے ساتھ زور سے گونجی۔ بارش کے اس طوفانی میدان میں،ان دو ہاتھوں کے ملنے اور بجلی کے کڑکنے کے ساتھ ہی دوستی کا عہد رقم ہو چکا تھا۔

اور پھر بارش اور بجلی کی اس خوفناک یاد کی دھند فضا سے چھٹی اور باکسنگ کلب کا شور، چمڑے پر پڑتے گھونسوں کی آوازیں اور زرد لائٹوں کا حال واپس لوٹ آیا۔سقراط کو یاد تھا انکی دوسری ملاقات اسی کلب میں ہوئی تھی۔یہ کلب ایک سال پہلے قائم ہوا تھا اور تب ہر طبقے کے لڑکے یہاں آنے کو بے چین رہتے تھے۔ان میں سقراط بھی تھا۔وہ حق کو یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا اور پھر کب ان کی بات چیت دوستی میں بدل پتا ہی نہیں چلا۔ایک سال میں وہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزم ہو گئے۔

حق نے صوفے پر تھوڑا سیدھا ہوتے ہوئے،سامنے رنگ میں لڑتے فائٹرز پر سے نظریں ہٹائیں اور سقراط کے سوال کا پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"باکسنگ میرا شوق ہے اور سرجن بننا میرا جنون۔"

"تم واقعی جنونی ہو حق!" سقراط مسکرایا۔

"جتنا تم ہاکی کو لے کر ہو اس سے تھوڑا کم..." اسکے تبصرے پر سقراط پھر سے مسکرا دیا۔ گہری بھوری آنکھوں میں چمک سی تھی۔

"سرمد بھائی چاہتے تھے میں ڈاکٹر بنوں..." سقراط نے حق کے چہرے پر نظریں جمائے انکشاف کیا۔

"تھینک گاڈ تم نہیں بنے..." حق نے گہری سانس لی۔

"کیوں؟" سقراط نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ایک فیلڈ میں ایک ہی غنڈہ اچھا لگتا ہے۔" حق نے شانے اچکا کر کہا تو سقراط زور سے ہنس دیا۔

"اچھا ہوا تم بھی ڈاکٹر ہو ہاکی پلیئر نہیں..." حق نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں جانتا ہوں ایک ٹیم میں ایک ہی کیپٹن اچھا لگتا ہے۔" حق کے جملہ مکمل کرنے پر سقراط پھر سے ہنس دیا۔ وہ وقت ہی ایسا تھا۔ وہ بات بات پہ ہنسا کرتا تھا۔

"اور تمہیں لگتا ہے ہاکی بہت شریف کھیل ہے؟"

"نہیں۔" حق نے فوراً جواب دیا۔ "فرق صرف اتنا ہے کہ تم میدان میں لوگوں کی ٹانگیں توڑتے ہو اور میں ہسپتال میں مرہم پٹی کرتا ہوں۔"

"یعنی میں زخمی کرتا ہوں، تم علاج کرتے ہو؟"

"بالکل... بزنس ٹرمز ہیں ہمارے..." حق کے کہنے پر دونوں مسکرا دیے۔حق نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیا اور پھر چہرہ جھکائے فون چیک کرتے سقراط کو دیکھا۔

"واقعی اچھا ہوا تم ڈاکٹر نہیں بنے۔"

" کیوں؟" سقراط نے فوراً چہرہ اٹھایا۔

" کیونکہ مریض تمہیں دیکھنے آتے یا علاج کروانے؟"

یہ سنتے ہی سقراط نے شرٹ کا کالر سیدھا کیا۔"حسن بھی اللہ کی نعمت ہے۔"

"اور عقل؟" حق نے برجستہ پوچھا۔

"وہ بھی ہے۔" سقراط سیدھا ہوا۔

"ثبوت؟" حق نے ابرو اٹھائی۔

"میں تمہارا دوست ہوں۔"

حق چند لمحے خاموش رہا، پھر دھیمے سے مسکرایا۔جب سے سقراط اسکی زندگی میں آیا تھا وہ مسکرانے لگا تھا۔وہ ہنسنے لگا تھا۔کبھی کبھی وہ قہقہے بھی لگا لیتا تھا۔پرانے گھاؤ بھرنے لگے تھے۔سقراط کی اس دلیل کا تو حق پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا۔سقراط نے فون واپس رکھا اور اب پوری طرح حق کی طرف مڑ کر بیٹھ گیا۔

"تم واقعی ذہین ہو۔آئی کیو ٹیسٹ تو دیا ہی ہوگا نا بچپن میں؟"

حق نے چند لمحے اسے دیکھا، جیسے سوال پر غور کر رہا ہو۔ پھر نہایت سنجیدگی سے بولا۔

"لوگ ذہانت کو نمبروں میں کیوں ناپتے ہیں؟"

"کس سے ناپنا چاہیے؟" سقراط بھی سنجیدہ ہوا۔

"انسان کے فیصلوں سے..." حق نے سکون سے جواب دیا۔ کم بخت کلب میں جانے کونسی گفتگو لے کر بیٹھ گئے تھے۔

"بندہ اتنی جلدی جواب تب دیتا ہے جب دماغ پہلے سے دوڑ رہا ہو۔" سقراط نے فوراً کہا۔

"یا پھر سوال بہت آسان ہو۔" حق نے ہلکی سی گردن موڑی۔

"حق تم بندے کو عزت بھی دیتے ہو تو بے عزتی لگتی ہے۔"

"لیکن تمہارا متبادل کوئی بھی نہیں ہے۔ تمہارے لیے عزت ہی عزت ہے۔" وہ کتنے آرام سے کتنی بڑی بات کہہ گیا تھا۔ سقراط کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس نے گہری سانس لی۔ کبھی کبھی ایک اچھا دوست صرف ایک جملے سے برسوں کی تھکن اتار دیتا ہے۔ اس سے پہلے کہ سقراط اپنی بات پوری کرتا یا حق اس کی بات کا کوئی جواب دیتا، ایک نوجوان صوفے کی دوسری جانب آ کر حق کے بالکل برابر میں بیٹھ گیا۔ اس کا جسم کسرتی تھا اور اس کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ ابھر رہی تھی۔ اس نے حق کے صاف ستھرے برانڈڈ کپڑوں اور اس کے نفیس انداز کا جائزہ لیا۔

"دیکھو تو کون آیا ہے؟ ارے... بزدار صاحب آئے ہیں۔"

سقراط نے رخ موڑ کر اسے دیکھا جبکہ حق کے تاثرات بدل گئے۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ جنہیں بلاوجہ پنگا کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ یہ جوان بھی وہی تھا۔ حق کو یہاں کلب میں دیکھ کر اسکی روح مچل اٹھتی تھی۔

"سنا ہے باکسنگ کا بہت شوق ہے تمہیں؟ صرف شوق ہی ہے یا ہاتھ پیر چلانے بھی آتے ہیں..." دولڑکے اور اسکے دائیں بائیں آ کر بیٹھ گئے تھے۔سقراط کی تیوری چڑھ چکی تھی۔

"امیر لوگ اکثر ایسے ہی شوق پال لیتے ہیں تا کہ کلبوں میں بیٹھ کر روب جھاڑ سکیں۔مگر صوفے پر بیٹھ کر ہیرو بننا اور رنگ کے اندر جا کر خون تھوکنا...ان دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے، ہے نا ڈاکٹر صاحب؟"

وہ اونچی آواز میں تمسخرانہ کہہ رہے تھا، جس سے آس پاس بیٹھے چند مزید لوگوں کا دھیان بھی ان کی طرف منتقل ہو گیا۔حق کے چہرے پر سائے گہرے ہو گئے اور اس کی سفید پیشانی پر شدید ناگواری ابھری۔اس کی آنکھوں میں جمود کی جگہ کھٹور تپش جاگ اٹھی۔اس تمسخراڑانے والے لڑکے نے دو تین مزید جلے کٹے، تحقیر آمیز جملے کسے۔اور پھر...اگلے ہی پل سقراط اور ان لڑکوں نے حق کو ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے دیکھا۔

"حق، نہیں...!" سقراط خطرے کو محسوس کرتے ہوئے فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے حق کا شانہ تھامنا چاہا، "چھوڑو اس بیوقوف کو، تم اس کی باتوں پر کان مت دھرو۔"

مگر حق نے سقراط کا ہاتھ نفی میں جھٹک دیا۔اس کی نظریں اب طنز کرنے والے لڑکے کی آنکھوں میں گڑھی ہوئی تھیں۔

"اگر میں لڑا...اور جیت گیا تو؟" حق کی آواز اتنی مدہم، اتنی ٹھنڈی تھی کہ جیسے فضا میں برف جم جائے۔وہ تمسخراڑاتا لڑکا بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے قہقہہ لگایا اور اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔

"اگر تم لڑے اور جیت گئے...تو جو تم کہو گے، میں وہ کروں گا۔لیکن اگر ہار گئے، تو تمہیں پورے کلب کے سامنے اپنی ناک رگڑ کر سب سے معافی مانگنی ہوگی۔"

آس پاس جیسے سنّاٹا چھا گیا۔حق نے بغیر کسی تردد کے، انتہائی سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔لڑکے نے سوچا تھا کہ حق ڈر کر پیچھے ہٹ جائے گا، مگر حق کے اس فیصلے نے اسے بھی پل بھر کو ٹھٹکا دیا۔اس نے سیٹی بجا کر کلب کے مینجر اور رنگ کے اینکر کو اشارہ کیا۔

"اوئے سنو! ایک نیا چیلنجر آیا ہے... یہ صاحب ہمیں باکسنگ کا ہنر سکھانا چاہتے ہیں۔" اس نے اونچی آواز میں نعرہ لگایا۔ کلب کے ہال میں موجود ہجوم کی توجہ فوراً ان کی طرف ہوگئی۔ اینکر نے، جس کے ہاتھ میں مائیک تھا، اپنے چہرے پر دلچسپی کی مسکراہٹ سجائی۔ اس کلب میں ایسے سرپرائز اوپن چیلنجز اکثر ہوا کرتے تھے جہاں شائقین میں سے کوئی بھی رنگ میں اتر سکتا تھا۔ اینکر کی بھاری آواز ہال کے سپیکرز میں گونجی۔

"آج کی رات ہمارے پاس ایک اسپیشل اوپن چیلنج موصول ہوا ہے۔ ایک نیا چیلنجر رنگ میں اترنے کے لیے تیار ہے۔"

"حق! تم پاگل ہو گئے ہو؟ وہ سامنے والا بندہ پروفائٹر ہے۔ تم ایک ڈاکٹر ہو۔ تمہارے ہاتھ میں اسٹھیٹو سکوپ اچھا لگتا ہے۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔"

مگر حق نے چلتے چلتے اپنی کلائی سے گھڑی اتاری اور سقراط کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے اپنا کوٹ اتارا، اپنی شرٹ کے بٹن کھولے اور آستینیں کہنیوں تک چڑھائیں۔

"چلو دیکھ لیتے ہیں ایک ڈاکٹر کے ہاتھوں میں کتنا دم ہے۔" وہ سقراط کی تشویش کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی لے میں بولا۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر لال رنگ کے باکسنگ گلوز چڑھا لیے اور منہ میں ماؤتھ گارڈ فٹ کیا۔ اینکر نے ہاتھ کے اشارے سے حق کو رنگ کی طرف بڑھنے کی اجازت دی۔ ہجوم کے درمیان سے گزرتے ہوئے، حق نے رنگ کے لال اور نیلے رسوں کو تھاما، اور ایک پُر اعتماد چھلانگ کے ساتھ رنگ کی لکڑی والی ایسٹروفلور پر اتر گیا۔ زرد، تیز سپاٹ لائٹس کا روشن دائرہ سیدھا حق کے وجود پر آ کر ٹھہر گیا۔ ہجوم کی طرف سے ہلکی چھیڑ چھاڑ، سیٹیاں اور تالیاں بج رہی تھیں۔ حق رنگ کے ایک کونے میں کھڑا ہوا، اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بند کیں اور آہستہ سے اپنے وجود کو گرم کرنے لگا۔ اور پھر رنگ کے دوسرے کونے سے اس کا حریف ایک لمبا، چوڑے سینے والا باکسر رسوں کو پار کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے دستانے سخت تھے اور چہرے پر اپنے شکار کو توڑ دینے کی سفاکانہ چمک تھی۔

باکسنگ کلب کے شور غوغا اور دھوئیں کے درمیان، سقراط رنگ سے ذرا دور کھڑا، فون کان سے لگائے دیوانہ وار اپنی ٹیم کے لڑکوں کے نمبر گھما رہا تھا۔ اس کا چہرہ سے لال ہو چکا تھا۔ اب وہ میسج ٹائپ کر رہا تھا۔ بالآخر ایک نے فون اٹھا لیا۔

"بے غیرتو! جلدی آؤ! یہاں ہم مارے جائیں گے۔"

سقراط نے فون پر چلاتے ہوئے کہا اور فون جیب میں ٹھونس کر فوراً رنگ کے بالکل پاس آ گیا۔ رنگ کے اندر اس وقت ایک المناک منظر چل رہا تھا۔ حق کو لڑنا آتا تھا۔ اس کے پنچز میں جان تھی، مگر وہ کوئی پروفیشنل باکسر نہیں تھا۔ وہ سامنے والے خونخوار حریف کو دو تین پنچ مارتا، مگر جواب میں اس کے منہ پر چھ زبردست گھونسے پڑتے۔ حق کی آستینیں، ماؤتھ گارڈ اور ہونٹ کا کونا خون سے لت پت ہو چکا تھا۔
مخالف باکسر اور رنگ کے باہر کھڑے اس کے اوباش دوست حق کی اس حالت پر کھلکھلا کر قہقہے لگا رہے تھے اور شائقین کا تماشا دیکھ کر دل بہلا رہے تھے۔ ہر بار جب حق کو حریف کا کوئی زوردار دھپ پڑتا... رنگ کے باہر کھڑے سقراط کی شکل دیکھنے کے قابل ہوتی۔ جب حریف کا پہلا رائٹ ہُک حق کے جبڑے پر پڑا تو سقراط نے اپنا منہ یوں بگاڑا جیسے وہ گھونسا حق کے نہیں، خود سقراط کے گال پر پڑا ہو۔

"اوہو... میری توبہ!" سقراط نے ایک آنکھ بند کر کے اپنے گال پر ہاتھ رکھا۔ جب اگلا اپر کٹ حق کے پیٹ پر لگا اور حق کا سانس اٹکا، تو سقراط نے بے ساختہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دہرا ہو گیا۔ چند منٹ تک یہ دردناک اور مضحکہ خیز تماشہ یوں ہی چلتا رہا۔ حق لہولہان ہو کر بھی جنونی کی طرح ڈٹا ہوا تھا اور سقراط باہر کھڑا ہر پنچ پر اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔ اور پھر اچانک کلب کی مرکزی اینٹری کا بھاری شیشے کا دروازہ زوردار دھماکے کے ساتھ کھلا۔ کلب کے اندر ایک دم اودھم سا مچ گیا۔ سقراط کے بلاوے پر اس کی ہاکی ٹیم کے سات آٹھ سرپھرے اور ہٹے کٹے لڑکے اندر داخل ہوئے تھے اور وہ خالی ہاتھ بالکل نہیں آئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہاکی اسٹکس، ڈنڈے اور دھوئیں والے کلر بم تھے۔ اگلے ہی سیکنڈ، ہال میں دھوئیں والے بم پھٹے اور پورے کلب میں لال، نیلے اور دم گھوٹنے والے زہریلے دھوئیں کا راج ہو گیا۔ لوگوں کا دم گھٹنے لگا، سیٹیاں، چیخیں اور بھگدڑ کا شور مچ گیا۔ ہال کی دھندلی زرد روشنی میں ہاکی اسٹکس کے لکڑی سے ٹکرانے کی آوازیں گونجنے لگی۔ ایک اڑتا ہوا سرپھرا لڑکا دھوئیں کے درمیان سے نمودار ہوا، اس نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک زبردست پالشڈ ہاکی اسٹک سقراط کی طرف اچھالی۔

" کیپٹن، پکڑ!" سقراط نے سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے، ہوا میں ہی وہ ہاکی اسٹک کیچ کی۔ بغیر وقت ضائع کیے ایک ہی چھلانگ میں رنگ کے رسوں کو پار کیا اور سیدھا رنگ کے اندر کود گیا۔

"حق پیچھے ہٹو..." اس نے غرّاتے ہوئے اپنی ہاکی اسٹک گھمائی اور پہلا شاٹ سیدھا اس حریف باکسر کی ٹانگ کے شن گارڈ پر دے مارا۔ باکسر کی دردناک چیخ گونجی۔ وہ ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ لہولہان حق، اس پر ٹوٹ پڑا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ دونوں مل کر اس حریف باکسر کو بری طرح مار رہے تھے۔ سقراط ہاکی اسٹک سے اس کے شانوں، کمر اور پسلیوں پر ڈرا ڈرا وار کر رہا تھا، اور حق اپنے ہاتھوں سے اس کے چہرے کو گھونسوں کا نشانہ بنا رہا تھا۔ وہ حریف باکسر اب رنگ کے فرش پر پڑا کراہ رہا تھا اور اس کے اوباش دوست دھوئیں میں ہاکیوں کی مار

کھاتے ہوئے ادھرادھر بھاگ رہے تھے۔کلب کی ایمرجنسی سیکیورٹی کا تیز الارم بج اٹھا۔سرخ رنگ کی وارننگ لائٹس گھومنے لگیں اور کلب کے درجنوں ہٹے کٹے سیکیورٹی گارڈز ڈنڈے اور پسٹل تھامے رنگ کی طرف لپکے۔

"بھاگو!سیکیورٹی آ گئی!"سقراط کی ٹیم کا ایک لڑکا دھوئیں میں سے چیخا۔

"حق! چلونکلو یہاں سے..."سقراط نے حق کی آستین سے پکڑ کر اسے جھٹکا دیا۔حق نے اپنے منہ کا خون آستین سے صاف کیا،اور دونوں نے رنگ کے رسوں کے اوپر سے چھلانگ لگا دی۔ پورے کلب میں افراتفری، بھگدڑ اور دھوئیں کا طوفان تھا۔لوگ ایک دوسرے کے اوپر گر رہے تھے،گارڈز ڈنڈے چلا رہے تھے اور سقراط کی ٹیم کے لڑکے ہاکیوں کے ذریعے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

پھر سقراط اور حق...ایک کا لباس خون سے خراب تھا اور دوسرے کی شرٹ دھوئیں سے کالی ہو چکی تھی، وہ دونوں ہجوم کو چیرتے ہوئے پچھلے ایمرجنسی ایگزٹ کے دروازے کی طرف اندھا دھند بھاگے۔سقراط نے لکڑی کا بھاری دروازہ اپنے شانے کی ٹکر سے کھولا،اور دونوں رات کے اندھیرے گلی میں نکل کر گرتے پڑتے بھاگنے لگے۔ پیچھے کلب کے اندر الارم کی چیخیں اور سیکیورٹی کی گالیاں مدہم ہوتی جا رہی تھیں۔ دو گلیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد،ایک سنسان روڈ پر آ کر دونوں ایک بند دکان کے تھڑے کے پاس رکے۔دونوں کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔حق نے تھڑے سے ٹیک لگائی،اس کی آنکھ کا کونا سوج چکا تھا اور ہونٹ سے خون رس رہا تھا۔دوسری طرف سقراط ہاتھ میں ہاکی لیے،گھٹنوں پر ہاتھ رکھے جھکا ہوا تھا اور زور زور سے سانس لے رہا تھا۔خود پر قابو پاتے اس نے سر اٹھایا اور حق کو دیکھا جو اپنے ہاتھ سے اپنے پھٹے ہوئے ہونٹ کو چھو کر دیکھ رہا تھا۔گردن جھٹکتے ہوئے سقراط بے ساختہ ہنس دیا۔

"ڈاکٹر صاحب! آئندہ اگر باکسنگ کا شوق چڑھانا تو مُجھے پہلے بتا دینا، میں اپنے ساتھ چھ سات ہاکیاں لے آؤں گا۔"وہ پھولے ہوئے تنفس کے ساتھ ہنسنے کی کوشش میں بے حال ہو رہا تھا جبکہ حق اپنی شرٹ کی حالت دیکھتے ہوئے ناگواری سے اس باکسر کو القابات سے نواز رہا تھا۔

"ویسے تم نے ٹھیک کہا تھا۔"سقراط نے سیدھے ہوتے ذرا سنجیدگی سے کہا۔اسکی آنکھوں میں شرارت چھپی ہوئی تھی۔حق نے قدرے خفگی سے اسے دیکھا۔

"انسان کی ذہانت کا اندازہ اسکے فیصلوں سے ہوتا ہے...لو دیکھ لی تمہاری ذہانت!"ہاکی سے حق ہے چہرے کی جانب اشارہ کرتے وہ اپنی

ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔حق نے اپنے لہولہان چہرے کے ساتھ سقراط کو دیکھا۔دونوں کی نظریں ملیں، چند پل کا سناٹا چھایا اور پھر بے ساختہ دونوں کا قہقہہ ابل پڑا۔

"بلڈی ایڈیٹس! "(Bloody Idiots) حق کراہ کر کہتا ہوا آگے بڑھا۔سقراط ہنستے ہوئے اسکے پیچھے لپکا۔

"ہم اب اس کلب میں نہیں آئیں گے۔"

" کل ہی بند کرواتا ہوں یہ کلب..." حق جل بھن کر کہہ رہا تھا۔ رات کے سنسان راستے پر، ان دو لڑکوں کے ہنسنے اور خون پسینے کی سوندھی بو فضا میں گھل رہی تھی۔

☆...☆...☆

دس سال پہلے کا شبگیر ہاؤس آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ روشن اور رونق سے بھرا ہوا تھا۔وہاں کی ہواؤں میں زہرہ بیگم کی محبت اور بچوں کی معصوم شرارتوں کا راج تھا۔سقراط گھر پہنچا تو اس کے ایک ہاتھ میں فخر سے چمکتی ہوئی ٹرافی تھی، مگر اسکے ساتھ زخمی حق بھی تھا۔حق کا نفاست پسند روپ اس وقت غائب تھا۔اس کی آنکھ کا گوشہ سوجا ہوا تھا، ہونٹ پر شگاف تھا اور شرٹ پر خون اور دھوئیں کے دھبے تھے۔
حق شبگیر ہاؤس آتے ہوئے ہمیشہ تھوڑا ہچکچاتا تھا۔مگر سقراط اس کی ایک نہیں سنتا تھا اور دھونس سے اسے کھینچ کر لے آتا تھا۔پچھلے چھ مہینوں میں حق یہاں صرف چند بار ہی آیا تھا مگر اس گھر کی گرم جوشی اسے اندر تک بھاتی تھی۔

"یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے حق؟"

زہرہ بیگم باورچی خانے سے گرم ہلدی ملا دودھ کا گلاس تھامے پریشانی سے باہر آئیں۔
حق اس وقت لاؤنج کے بڑے شیشے کے سامنے کھڑا تھا اور کھلے ہوئے فرسٹ ایڈ باکس سے کاٹن اور اینٹی سیپٹک سے اپنے زخم صاف کر کے مرہم پٹی کر رہا تھا۔
لاؤنج میں ایک طرف گیارہ سالہ نامرہ اور چار پانچ سال کی تارہ اور نوفہ ایک ساتھ کھیل رہی تھیں جبکہ صوفے پر ساڑھے پندرہ سالہ نیمل اور بارہ سال کا سلال بیٹھے ہوئے تھے۔سلال کی نظریں سقراط کی چمکتی ٹرافی پر جمی تھیں، جبکہ نیمل سنجیدہ خاتون کی طرح ہاتھ گود میں رکھے حق کو

گھوررہی تھی۔نیمل نے اپنا سر ذراسا موڑا اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"آپ کوایسانہیں کرنا چاہیے تھا، چاچو!"

سقراط نے، جوصوفے پر ڈھہ کر پانی پی رہا تھا، بے ساختہ دہائی دی۔

"یہ میں نے نہیں، اس نے خود اپنے ساتھ کیا ہے۔" اس نے سقراط کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"ہاں یہ میں نے کیا ہے۔"

حق نے شیشے سے پلٹ کر نیمل کو دیکھا۔اس کی آنکھوں میں ایک نرم سا تاثر ابھرا۔نیمل فکرمندی سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔حق اگرچہ پچھلے چھ مہینوں میں یہاں چند ایک بار ہی آیا تھا، مگر نیمل کو اس سے بہت اچھی وائبز آتی تھیں۔حق کا اٹھنا، بیٹھنا، بولنا...اسکی سنجیدگی سب اسے پسند تھا۔وہ اسکے ماموں کا بیٹا تھا اور نیمل کو اس پر اکثر فخر محسوس ہوتا تھا۔اس نے اپنی نوکدار ٹھوڑی پر ہاتھ رکھا اور بڑے سنجیدہ انداز میں حق کے سوجے ہوئے گال کا جائزہ لیا۔

"آپ کے خوبصورت چہرے کی حالت کافی بدتر ہو چکی ہے ہینری!"

حق کے سپاٹ چہرے پر نیمل کے اس معصوم جملے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"شکریہ، نیمل صاحبہ! مگر ہینری صاحب کو بھی کبھی کبھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔" حق نے کاٹن کی پٹی اپنے ہونٹ پر چپکاتے ہوئے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ کہا۔

"ہینری کون ہے اب؟" سلال نے الٹے سیدھے منہ بناتے ہوئے نیمل سے پوچھا۔جب پچھلی بار نیمل نے حق سے کہا تھا کہ وہ ہینری جیسا لگتا ہے تب سلال وہاں نہیں تھا ورنہ اسے یہ سوال پوچھنے کی نوبت نہ آتی۔

" کسی ناول کا ہیرو ہے؟" حق نے پلٹتے ہوئے سوالیہ نظروں سے نیمل کو دیکھا۔

"میں ناولز نہیں پڑھتی..." وہ گردن سیدھی کیے سنجیدگی سے بولی۔

" کیوں؟" حق نے اچنبھے سے پوچھا۔سقراط اٹھ کر کچن کی جانب جا چکا تھا۔اسے حق کی خاطر تواضع کرنا اچھا لگتا تھا۔

"مُجھے کچھ کرداروں سے الجھن ہوتی ہے۔"

" کس قسم کے کرداروں سے؟" ان کی گفتگو دلچسپ ہو رہی تھی۔

"وہی جو آخر میں آتے ہیں اور پوری کہانی کھا جاتے ہیں۔" نیمل نے ناپسندیدگی سے کہا تو حق نے ہونٹ بھینچ کر اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

" تمہیں کہانیاں نہیں پسند یا کہانی کھانے والے کردار؟" حق نے میز پر رکھا اپنا فون اٹھاتے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔نظریں اسکرین پہ تھیں۔وہ کوئی اہم ای میل پڑھ رہا تھا مگر دھیان نیمل کی جانب تھا۔

نیمل نے چند لمحے اسے دیکھا، پھر اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں بولی۔" کہانی کھا جانے والے کردار۔"

" کیوں؟" حق کے انگوٹھے اسکرین پر چلتے رہے۔

" کیونکہ وہ انصاف نہیں کرتے۔" نیمل نے فوراً جواب دیا۔"پوری کتاب کسی اور کی ہوتی ہے لیکن آخر میں لوگ صرف انہی کو یاد رکھتے ہیں۔"

حق کے لبوں کے کنارے ہلکے سے ہلے مگر اس نے سر نہیں اٹھایا۔اس نے ای میل بھیج کر فون لاک کیا اور پھر پوری توجہ سے نیمل کو دیکھا۔

"ضروری نہیں وہ کردار کہانی کھا گیا ہو۔"

نیمل خاموش رہی مگر اسکی نگاہیں الجھی ہوئی تھیں۔

"ممکن ہے...وہ صرف کہانی کا سب سے بھاری حصہ اٹھا رہا ہو۔"

لاؤنج میں چند لمحوں کے لیے خاموشی اتر آئی۔سلال نے پلکیں جھپکائیں۔

"فرق کیا ہوا؟"

حق نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"جس کردار کے حصے میں سب سے زیادہ بوجھ آتا ہے...اکثر یاد بھی وہی رہ جاتا ہے۔"

نیمل کی بھنویں ہلکی سی سمٹیں۔

"پھر بھی مُجھے ایسے کردار پسند نہیں۔وہ باقی سب کو چھوٹا کر دیتے ہیں۔"

حق نے ایک لمحے تک اس کی آنکھوں میں دیکھا۔دو چھوٹی چھوٹی سیاہ مگر روشن آنکھیں۔پھر وہ انتہائی دھیمے لہجے میں بولا۔

"اچھے کردار دوسروں کو چھوٹا نہیں کرتے،صرف کہانی کو بڑا کر دیتے ہیں۔"

نیمل بے اختیار ٹھٹک گئی۔پتا نہیں کیوں...یہ جملہ اس کی عمر سے کہیں بڑا محسوس ہوا۔
سلال اب بھی منہ کھولے کبھی حق کو دیکھ رہا تھا،کبھی نیمل کو۔باتیں اسکے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

"ایک دن میں تمہیں ایک کتاب دوں گا پھر پڑھ کر بتانا کہ اسکا ایک اہم کردار کہانی کھا گیا تھا یا کہانی نے اسے کھا لیا تھا۔"

"آپ دونوں آخر بات کس چیز کی کر رہے ہیں؟"

حق نے سکون سے دودھ کا گلاس اٹھایا۔

"جب تم بڑے ہو جاؤ گے...شاید سمجھ جاؤ۔"

"یعنی ابھی میں بچہ ہوں؟"

"یہ تم نے خود کہا ہے۔"

نیمل کے جواب پر سلال نے منہ بنایا، جبکہ نیمل کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ آ گئی۔اسے اچھا لگتا تھا جب حق صرف جواب نہیں دیتا تھا، ہر سوال کو اپنی اصل شکل بدلنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

اسی اثنا میں، گھر کے مرکزی دروازے سے سرمد شبگیر داخل ہوئے۔ماضی کے سرمد صاحب کے چہرے پر ایک تلخ اور سخت تاثر رہتا تھا۔ لاؤنج سے آوازیں سن کر انہوں نے جیسے ہی قدم اندر رکھے، ان کی نظر صوفے پہ بیٹھے زخمی حق پر پڑی۔ سرمد صاحب کے چہرے پر ناگواری سی ابھری۔ان کے ابرو تن گئے۔یہ اس شخص کا بیٹا تھا جس کے قتل کی سزا ان کی کزن جیل میں کاٹ رہی تھی۔انہیں حق کچھ خاص پسند نہیں تھا مگر وہ سرِعام اسکا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"السلام علیکم!" حق نے انہیں دیکھ کر سلام کیا۔اسے بھی سرمد صاحب کی موجودگی میں غیر آرام دہ محسوس ہوتا تھا۔سرمد صاحب نے کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی۔انہوں نے سر کو ہلکا سا خم دے کر جواب دیا اور بغیر ایک لفظ بولے، اپنے بھاری قدم اٹھاتے ہوئے سیدھے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔نیمل کے چہرے کی مسکراہٹ بجھ گئی۔لاؤنج میں ایک سیکنڈ کے لیے سناٹا چھا گیا۔حق کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا یہاں ہونا سرمد شبگیر کو کتنا ناگوار گزرا تھا۔دادی عشاء کی نماز کے بعد اب لاؤنج میں آ چکی تھیں۔زہرہ بیگم کچن سے نکلتے ہوئے گویا اعلان کیا۔

"حق بیٹا،تم کپڑے تبدیل کر کے ہاتھ منہ دھولو،کھانا کھا کر ہی جانا۔"ان کے ساتھ ہی سقراط کچن سے باہر آیا تھا۔وہ کب سے زہرہ بیگم سے جانے کیا کھسر پھسر کر رہا تھا۔

"آجاؤ حق!"سیب کو دانتوں سے کترتے سقراط نے حق کو بلایا تھا تاکہ وہ اپنے کپڑے بدل سکے۔حق گہری سانس لیتے اٹھ کھڑا ہوا۔

"نیمل!آؤ ذرا میری مدد کرو۔"

"جی امی..."نیمل فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔زہرہ بیگم،پانی کا گلاس لیے سرمد صاحب کو دیکھنے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں،جبکہ نیمل باورچی خانے کی طرف چلی گئی سلال وہیں دادی کے پاس بیٹھا رہا گیا۔

"یہ یہاں کیوں آتا ہے؟"دادی نے دھیمے لہجے میں قدرے خفگی سے سلال کو دیکھا۔

"یہ حق بھائی کی پھوپھو کا گھر ہے...لوگ اپنی پھوپھو کے گھر کیوں آتے ہیں دادی؟"

اس سے پہلے دادی کوئی جواب دیتیں،صوفے کے پیچھے بیٹھی تارہ نے کھیل کھیل میں ہوئی ان بن پر نوفہ کے منہ پر تھپڑ دے مارا تھا جس سے نوفہ کے رونے کی آواز پورے لاؤنج میں گونج اٹھی۔نامرہ نے الٹا تارہ کو مارا اور نوفہ کو چپ کروانے کی کوشش کی۔سلال ان کی طرف بڑھا جبکہ دادی نے اپنا سر تھام لیا۔

"لو ہو گیا ریڈیو پاکستان شروع..."بچوں کے ہر وقت چیخنے چلانے نے دادی کو پریشان کر رکھا تھا۔سلال اب نوفہ کو گود میں اٹھائے چپ کروا رہا تھا جبکہ تارہ منہ بسورے نامرہ کو گھور رہی تھی۔بس اسکے رونے میں چند منٹ ہی باقی تھے پھر ہوگا اصلی ریو یو پاکستان شروع۔

☆...☆...☆

اسٹیڈیم کے شور کے بعد بزدار پیلس کی خاموشی نجف کو کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔
سقراط کا میچ ختم ہوتے ہی نشاط نجف کو بغیر بتائے،اسٹیڈیم کے ہجوم میں اکیلا چھوڑ کر بن بتائے وہاں سے چلی گئی تھی۔اور اس وقت وہ کافی

پرسکون سی اپنے کمرے میں موجود تھی۔

"تم نے ایسا کیوں کیا نشاط؟ تم جانتی ہو اگر ڈیڈ کو پتا چلا تو ہمارا حق کے ساتھ آنا جانا بھی بند ہو جائے گا۔"

نجف نالاں قدموں سے اس کے قریب آئی۔ امجد بزدار نے ڈرائیور کو خاص تاکید کر رکھی تھی کہ وہ ان کی اجازت کے بنا نجف اور نشاط کو کہیں لے کر نہ جائے۔ کبھی کبھی تو ان کے ساتھ گارڈ بھی ہوتا تھا۔ وہ دونوں اس زندگی سے تنگ تھیں مگر حق ان کے لیے پھر آسانی کرتا رہتا تھا مگر نشاط؟ اسکے پاس آج اچھا موقع تھا اور اس نے فائدہ اٹھالیا۔

"تم کچھ وقت رک سکتی تھیں۔ تم مُجھے بتا سکتی تھیں۔" نجف کی آواز میں شکوہ اور تھکن واضح تھی۔ بیڈ پر نیم دراز نشاط جو ایک ماڈلنگ میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی، اس نے اپنا سر موڑ کر نجف کو دیکھا، اس کی نظروں میں برفانی ٹھنڈک تھی۔

"مُجھے ایک اسٹوڈیو جانا تھا۔ میری فرینڈ کا فوٹو شوٹ تھا۔"

نجف نے حیرت سے نشاط کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"فوٹو شوٹ؟" نجف نے بے یقینی سے دہرایا، پھر اس کے سمجھانے والے انداز میں، نشاط کے بالکل سامنے، بستر پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا، "تم کیوں اپنی زندگی مشکل بنا رہی ہو نشاط؟ تمہیں پتا ہے ڈیڈ کو اگر اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو کیا ہوگا؟ وہ اس سب کے لیے کبھی نہیں مانیں گے۔"

نشاط نے شدید ضبط سے اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ چند گہرے سانس لیے پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کی پتلیوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

"تو کیا کروں؟ گھٹ گھٹ کر مر جاؤں؟" اس نے نجف کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھی۔ اس کا پورا وجود غصے اور بے بسی سے کانپ رہا تھا۔

"مجھ سے نہیں ہوتی یہ پڑھائی! سمجھ کیوں نہیں آتا کسی کو؟ مجھے نہیں بننا ڈاکٹر..."

اس نے شدتِ طیش میں آ کر اسٹڈی ٹیبل پر پڑے اپنے اینا ٹمی اور فزیالوجی کے تمام بھاری بھرکم رجسٹرز، این سی پی سی کی کتابیں اور ہائی لائٹرز دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر فرش پر پھینک دیے۔ کتابیں اور ورق پورے کمرے میں بکھر گئے۔ آج اس نے اسکرین کی آزاد دنیا کو قریب سے دیکھا تھا اور آج اسے زیادہ دکھ ہو رہا تھا۔

"مجھے یہ نام، یہ بڑا خاندان اور اسکا طوق اپنے گلے میں نہیں چاہیے۔" نشاط شدتِ ضبط سے چلا رہی تھی۔ "میں ایکٹریس بننا چاہتی ہوں، میں کیمرے کے سامنے کھل کر جینا چاہتی ہوں، میں ایک عام اور پرسکون زندگی گزارنا چاہتی ہوں، مجھ سے اتنا بڑا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا... کیوں مجھ پر وہ خواب تھوپے جا رہے ہیں جو میرے ہیں ہی نہیں؟ ڈیڈ کا بس چلے تو وہ ہماری سانسوں پر بھی اپنا اختیار لکھ دیں۔"

کم عمر، جذباتی اور کم عقل نشاط، اپنی دم گھوٹتی حقیقت کے سامنے سخت لاچار تھی۔ اسے بزدار پیلس کا یہ قید خانہ اور میڈیکل کا یہ بوجھ کسی صورت منظور نہیں تھا۔
اپنی تمام تر چیخ و پکار اور غبار نکالنے کے بعد، نشاط کے شانے ڈھیلے پڑ گئے اور وہ بکھری ہوئی کتابوں کے پاس فرش پر ہی بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور زار و قطار رو پڑی۔ نجف ساکت بیٹھی یہ سب دیکھتی رہی۔ اس نے نشاط کو بولنے دیا، اس کا سارا غصہ اور دکھ بہنے دیا۔ جب نشاط کی سسکیاں مدہم ہوئیں، تو نجف بستر سے اتری۔ وہ بکھری ہوئی کتابوں اور کاغذوں کو نظر انداز کرتی ہوئی، خود اپنے گھٹنے موڑ کر نشاط کے بالکل سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے نہایت نرمی سے نشاط کی کلائیوں کو چھوا اور اس کے کانپتے ہاتھوں کو اس کے چہرے سے ہٹا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا۔

"نشاط... میری طرف دیکھو۔" نجف نے محبت اور بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔ نشاط نے روتے ہوئے، سرخ آنکھوں سے نجف کو دیکھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا، نشاط... تم تنہا نہیں ہو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔"

"کچھ ٹھیک نہیں ہوگا نجف... ڈیڈ ہمیں پیس کر رکھ دیں گے۔" نشاط نے سسکی لی۔
"میں ایسا نہیں ہونے دوں گی..." نجف نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حتمی اور مضبوط لہجے میں کہا، "اگر تمہیں پڑھائی میں مشکل ہوتی ہے، تو میں تمہاری ہیلپ کروں گی۔ تمہارے نوٹس میں بناؤں گی، تمہارے ٹیسٹ میں یاد کرواؤں گی... لیکن پلیز، یوں خود کو مت

توڑو۔ہم دونوں مل کر اس راستے کو پار کریں گے۔اور ڈیڈ سے بات کرنے کا صحیح وقت آئے گا،تو میں تمہارے لیے کھڑی ہوں گی۔"

نجف نے نشاط کو آگے بڑھ کر اپنے آغوش میں لے لیا۔نشاط نے اپنا سر نجف کے شانے پر رکھ دیا اور خاموشی سے روتی رہی۔وہ دونوں بہنیں،اس عالیشان کمرے کے فرش پر بکھری کتابوں کے درمیان ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں۔نجف اپنی بہن کی ہر تکلیف اپنے اندر سمیٹ رہی تھی۔

"پلیز ڈیڈ سے کہو نا مُجھے آزاد کر دیں...ان سے کہو نا پلیز..."وہ نجف کی منتیں کر رہی تھی اور نجف نے فیصلہ کر لیا تھا وہ اپنے باپ سے ضرور بات کرے گی۔وہ بہت اچھی ڈاکٹر بنے گی۔ہسپتال کا چارج سنبھالے گی۔وہ سب کرے گی جو امجد بزدار چاہیں گے مگر بدلے میں وہ نشاط کی آزادی مانگے گی۔اسے یقین تھا ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔

☆...☆...☆

۲۰ اگست:دس سال پہلے

وقت کسی تیز بہتے دریا کی طرح گزر رہا تھا۔میڈیکل کالج کی کلاسیں،ہاکی کے ٹورنامنٹس،رات گئے تک ہونے والی گروپ اسٹڈیز اور ویک اینڈ کی مختصر ملاقاتیں...ان سب نے دیکھتے ہی دیکھتے کئی مہینے نگل لیے تھے۔اس دوران حق بزدار اور سقراط شبگیر کی دوستی غیر معمولی حد تک گہری ہو چکی تھی۔لوگ کہتے تھے کہ اگر حق نہ ملے تو سقراط سے پوچھ لو،اور اگر سقراط نہ دکھائی دے تو حق کا پتہ ڈھونڈو!

ان ملاقاتوں میں اکثر نجف اور نشاط بھی شامل ہوتیں۔چار لوگ،چار الگ مزاج مگر ایک ہی دائرہ۔دلچسپ بات یہ تھی کہ سقراط اور نجف کبھی تنہائی میں نہیں ملے تھے۔کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔اور شاید سقراط نے کبھی کوشش بھی نہیں کی۔اسے صرف اتنا کافی لگتا تھا کہ نجف سامنے بیٹھی ہو۔وہ بولتی رہے،ہنستی رہے اور وہ خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہے۔بھابھی کی بہن بچپن میں بھی آیا کرتی تھی مگر پھر بیچ کے کئی سال ناراضی کی نذر ہو گئے۔اب ان کا میل جول پھر سے ہو گیا تھا۔وہ شہد رنگ بالوں والی لڑکی جو تتلیوں والے کلپس لگایا کرتی تھی اب وہ بڑی ہو چکی تھی۔

سقراط کی آنکھیں اس کے دل کی سب سے بڑی غدار تھیں۔

وہ لاکھ اپنے چہرے کو سپاٹ رکھتا، مگر نجف جیسے ہی بولتی...اس کی نظریں خود بخود اسی پر جا ٹھہرتیں۔حق کئی بار یہ بات نوٹ کر چکا تھا۔نشاط نے بھی کیا مگر نجف...

نجف ہمیشہ کی طرح بے خبر تھی یا بے خبر رہنا چاہتی تھی۔

آج بیس اگست تھا۔سقراط شبگیر کی سالگرہ۔حق اوران کے چند قریبی دوستوں نے شہر کے ایک خوبصورت ریستوران میں چھوٹی سی تقریب رکھی تھی۔ہال رنگ برنگی روشنیوں سے سجا ہوا تھا۔ایک طرف سادہ سا سالگرہ کا بورڈ لگا تھا، درمیان میں چاکلیٹ کیک رکھا تھا اور میزوں پر سفید للّی کے پھول سجے تھے۔سقراط آج غیر معمولی طور پر وجیہہ لگ رہا تھا۔سیاہ شرٹ، اسی رنگ کا ٹراؤزر، چوڑے کندھے، کلائی پر سادہ گھڑی...اور بال گردن کے پیچھے بندھے ہوئے تھے، اگرچہ چند ضدی لٹیں نکلی ہوئی تھیں مگر وہ بے حد اچھا لگ رہا تھا۔وہ دوستوں سے مسکرا کر مل رہا تھا۔مگر ہر چند لمحوں بعد اس کی نظریں ریستوران کے شیشے سے باہر چلی جاتیں۔حق ابھی تک نہیں آیا تھا۔اور اس کے ساتھ...نجف بھی۔ایک دوست نے کہنی ماری۔

"سالگرہ تمہاری ہے یا دروازے کی؟ ہر دو منٹ بعد باہر کیوں دیکھ رہے ہو؟"

سقراط ہلکا سا مسکرایا۔"بس...آتے ہی ہوں گے۔" مگر اس کی نظریں پھر باہر چلی گئیں۔وہ ان کے بنا کیک نہیں کاٹنا چاہتا تھا۔چند لمحے بعد ایک بڑی سیاہ گاڑی ریستوران کے سامنے آ کر رکی۔سقراط کی آنکھوں میں بے اختیار چمک آ گئی۔ڈرائیونگ سیٹ سے حق اترا۔اگلے دروازے سے ایک دبلا پتلا نوجوان باہر نکلا۔

اور پھر...پچھلا دروازہ کھلا۔سب سے پہلے نجف باہر اتری۔وہ عام سے سادہ کپڑوں میں تھی۔ اس کے ہاتھوں میں سفید للّی اور نیلے آئرس کے پھولوں کا خوبصورت گلدستہ تھا۔اس کے پیچھے نشاط اتری۔اس کے دونوں ہاتھ گفٹ بیگز سے بھرے ہوئے تھے۔

"سوری!" حق نے دور سے ہی ہاتھ لہرایا۔

"کلاس ختم ہونے میں دیر ہو گئی تھی۔" حق انہیں کالج سے لایا تھا۔ نشاط نے بھی ہاتھ ہلایا اور پھر وہ ٹھٹک گئی۔اس نے سقراط کو سر سے پیر تک دیکھا۔رف ٹف سے حلیے میں رہنے والا شخص آج اچھے خاصے حلیے میں تھا۔اسکا ٹھٹکنا تو بنتا تھا۔

"پَپّی برتھ ڈے، سقراط!"

حق نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔سقراط کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔مگر اگلے ہی لمحے ...وہ اجنبی لڑکا گاڑی کا دروازہ بند کر کے نجف کے ساتھ آ ملا۔

"تم نے پھر میرا نوٹ بک رکھ لیا تھا؟" وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔نجف نے جواب میں کچھ کہا اور دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔سقراط کی مسکراہٹ اسی لمحے سمٹ گئی۔
اس کی آنکھوں کی روشنی جیسے کسی نے دھیرے سے چرا لی ہو۔وہ دونوں قریب آئے۔باری باری دونوں نے سقراط کو مبارکباد دی۔سقراط کی نظریں بار بار اس لڑکے پہ جا رہی تھیں۔جانے کیوں اسکی موجودگی یہاں بری لگی رہی تھی۔

" کون ہے؟" اس نے آہستہ سے نشاط سے پوچھا۔نشاط نے مڑ کر دیکھا۔

"اوہ...اعظم۔ہمارا کلاس فیلو ہے۔بہت اچھا لڑکا ہے۔"

نشاط،سقراط کے بدلتے تاثرات بخوبی دیکھ رہی تھی۔سقراط شبگیر نے اپنی سالگرہ پہ لعنت بھیجی۔

"شاید...نجف کو پسند بھی کرتا ہے۔"

یہ جملہ مذاق میں کہا گیا تھا۔مگر سقراط کے لیے...یہ مذاق نہیں تھا۔اسے یوں لگا جیسے کسی نے سینے کے اندر آہستگی سے کوئی چیز توڑ دی ہو۔
اس نے ایک بار پھر نجف کو دیکھا۔وہ اعظم سے بے تکلفی سے بات کر رہی تھی۔وہ ہنس رہی تھی۔اور سقراط...خاموش ہو گیا۔آہ کاش آج اسکی سالگرہ نہ ہوتی۔نجف اور نشاط پہ اتنی پابندیاں نہ ہوتیں تو حق کو انہیں براہ راست کالج سے نہ لانا پڑتا اور اعظم جیسی جونک ان کے ساتھ نہ آتی۔اسی دوران نشاط قریب کھڑی رہی۔آج وہ پہلی بار سقراط کو غور سے دیکھ رہی تھی۔سیاہ لباس...گہری بھوری آنکھیں...اور مضبوط شخصیت!

"یہ...اتنا ہینڈسم پہلے بھی تھا؟" وہ سوچ رہی تھی،پھر خود ہی چونک گئی۔ایک دھیمی مسکراہٹ اسکے چہرے پر آ ٹھہری۔

"ویسے...آج تو کافی تیاری کر رکھی ہے۔"

سقراط نے ہلکا سا سر ہلایا۔"دوستوں کی ضد تھی۔" مگر اس کی نظریں پھر نجف کی طرف چلی گئیں۔نشاط نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔وہ سمجھ گئی۔بالکل سمجھ گئی۔اس نے سقراط کی آنکھوں میں وہ کیفیت دیکھی تھی جو شاید خود سقراط بھی چھپا نہیں پا رہا تھا۔کیک کاٹا گیا۔ ہال شور سے بھر گیا۔نجف آگے بڑھی۔اس نے مسکراتے ہوئے ایک گفٹ باکس سقراط کی طرف بڑھایا۔

"سالگرہ مبارک ہو۔"

سقراط نے گلدستہ تو لے لیا۔مگر...اس نے نجف کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔جانے کیوں اس یہ تقریب اب بری لگ رہی تھی۔اس نے گہری سانس لیتے نظریں دوڑائیں۔حق ریستوران کے باہر کھڑا فون سن رہا تھا۔جانے اسے اتنے فون کس کے آتے تھے؟

"شکریہ..."سقراط نے نجف کے تحفے کے جواب میں یہی کہا۔

نجف چونکی۔"اتنے سنجیدہ کیوں ہو؟ کچھ ہوا ہے؟"

"نہیں۔"جواب مختصر تھا۔"بس...تھوڑا تھک گیا ہوں۔"

"ہم جانے ہی والے ہیں۔ڈرائیور انکل آتے ہوں گے۔بڑی مشکل سے انہیں کنوینس کیا تھا کہ ڈیڈ کو نہ بتائیں ہم یہاں ہیں۔تم بھی گھر جا کر آرام کرنا۔"

سقراط نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔وہ اپنے فون پہ مگن ہو چکا تھا۔وہ اسے نظر انداز کر رہا تھا۔نجف نے چند لمحے اسے دیکھا۔پھر کندھے اچکا کر واپس پلٹ گئی۔
وہ نہیں جانتی تھی کہ جس شخص کو وہ ناراض سمجھ رہی تھی وہ دراصل خاموشی سے اپنے دل کو سمجھا رہا تھا۔

"شاید...میں نے غلط جگہ دل لگا لیا ہے۔"سقراط کا سینہ بھاری ہو رہا تھا۔نشاط نے دور کھڑے یہ سب دیکھا۔نجف کے جاتے ہی اس کی

نظریں دوبارہ سقراط پر گئیں۔

پتا نہیں کیوں چند منٹ پہلے تک جو منظر اسے بالکل معمولی لگ رہا تھا، اب وہی منظر اس کے دل میں ہلکی سی کسک چھوڑ گیا۔ اس نے پہلی بار دل ہی دل میں یہ خواہش کی...کاش...سقراط کی نظریں نجف کے بجائے کسی اور کو تلاش کرتیں۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جہاں تین دلوں کی تقدیر خاموشی سے اپنی سمت بدلنے لگی۔

☆...☆...☆

ریسٹوران اب تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ چند میزوں پر بکھرے ہوئے خالی کپ، آدھے کھائے کیک کی پلیٹیں اور رنگ برنگے پھول اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ چند لمحے پہلے یہاں ہنسی گونج رہی تھی۔ باہر رات اپنی اداسی لیے اتر رہی تھی۔ نجف اور نشاط، ڈرائیور کے ساتھ واپس جا چکی تھیں۔ ہاکی ٹیم کے کھلاڑی اور دوسرے دوست بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ تقریب میں سے اب اس چھوٹے سے ریسٹوران میں صرف دو لوگ رہ گئے تھے۔ حق...اور سقراط۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے تھے۔ درمیان میں رکھی گول میز پر چائے کے دو کپ ٹھنڈے پڑنے لگے تھے۔ سقراط نے نظریں اٹھا کر حق کو دیکھا۔ پچھلے تقریباً پورے پروگرام میں حق آدھا وقت فون پر رہا تھا۔

"تم فون پر ہر وقت کیوں لگے رہتے ہو؟ آخر کونسی بلا ہے اس میں؟" سقراط نے آخر پوچھ ہی لیا۔ "پتا نہیں ایسی کون سی دنیا ہے جو ہر چند منٹ بعد تمہیں واپس بلا لیتی ہے۔"

حق نے جواب نہیں دیا۔ اس کی بھنویں ہلکی سی سکڑی ہوئی تھیں۔ اسکرین پر واٹس ایپ کھلا تھا۔ اوپر صرف ایک لفظ نظر آ رہا تھا۔

Typing...

دو آنکھیں کئی سیکنڈ تک اسی ایک لفظ کو دیکھتی رہیں۔ پھر اچانک پیغام آیا۔

"وہ حازق نہیں ہے۔"

صرف چار لفظ۔بس چار...مگر جیسے کسی نے حق کے سینے میں دفن کوئی پرانا زخم دوبارہ چاک کر دیا ہو۔اس کی انگلیاں ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئیں۔چہرے کا رنگ آہستہ آہستہ اترنے لگا۔جبڑے بھنچ گئے۔آنکھوں میں ویرانی اتری اور دل ڈوب گیا۔اس نے فون بند کیا...اور میز پر پٹخ دیا۔وہ کرسی پہ ذرا پیچھے ہوا۔ساتھ والی کرسی پر رکھا اپنا کوٹ اٹھایا۔جیب میں ہاتھ ڈالا۔ایک موٹا سا سگار اور لائٹر نکالا۔پھر چاندی کے لائٹر پر انگوٹھا پھیرا۔ایک ننھا سا شعلہ بھڑکا۔لائٹر پر بھیڑیے کا ابھرا ہوا سر آگ کی روشنی میں چند لمحوں کے لیے زندہ محسوس ہوا۔سقراط کی نظریں اسی پر جم گئیں۔حق نے خاموشی سے سگار سلگایا۔پہلا کش لیا۔دھواں آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں سے نکل کر ہوا میں تحلیل ہونے لگا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟"سقراط کا لہجہ سخت ہو گیا۔"تم نے سموکنگ کب شروع کی؟"

حق نے جواب دینے سے پہلے اپنی کنپٹی کو دو انگلیوں سے دبایا۔جیسے سر کے اندر کوئی ناقابلِ برداشت درد جاگ اٹھا ہو۔

"یاد نہیں۔"جواب صرف دو لفظی تھا۔اس نے دوبارہ ایک کش لیا۔شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک مڑی ہوئی تھیں۔بائیں کلائی پر سیاہ روشنائی سے بنا ایک مختصر سا لفظ نمایاں تھا۔

Alpha.

سقراط کی نظر چند لمحے وہیں رکی رہی۔ہاں وہ ٹیٹو تھا۔اسکی کلائی پہ چھوٹا سا الفا لکھا تھا۔

"آئی ایم سوری..تمہارا دن خراب کرنے کے لیے۔"

اسی لمحے ایک ویٹر جھجکتے ہوئے ان کی میز کے پاس آ رکا۔

"ایکسکیوزمی سر..."

حق نے گردن موڑی۔

"سر... یہاں سموکنگ کی اجازت نہیں ہے۔"

حق نے چند لمحے اسے دیکھا۔پھر ایک تلخ سی ہنسی اس کے لبوں پر آئی۔

"عجیب بات ہے۔نہ گھر میں پی سکتے ہیں...نہ ہسپتال میں...نہ ریستوران میں...نہ کھلی ہوا میں..."

پھر اس نے تمسخرانہ نظر ویٹر پہ ڈالی۔

"تو بتاؤ ہم سموکرز جہنم چلے جائیں؟"

ویٹر ہکلا گیا۔"سر...پلیز...رولز ہیں..."

حق نے بے زاری سے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔والٹ نکالا میز پر رکھ دیا۔

"اس میں چار کارڈز ہیں۔جتنا مناسب لگے رکھ لینا...بس مُجھے پانچ منٹ اکیلا چھوڑ دو۔"

ویٹر کو سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہے۔اس نے مدد طلب نظروں سے سقراط کو دیکھا۔
اسی لمحے سقراط کرسی سے اٹھا۔اس نے خاموشی سے حق کی انگلیوں سے سگار لے لیا اور ایک پلیٹ میں مسل دیا۔پھر ویٹر کی طرف دیکھ کر ہلکا سا سر ہلایا۔ویٹر نے تشکر سے سر جھکایا اور فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔

"کیا ہوا ہے؟" سقراط نے دھیرے سے پوچھا۔حق...کیا ہوا ہے؟"

حق کی نظریں میز پر جمی تھیں۔ہونٹ لرزے پھر بمشکل آواز نکلی۔

"وہ ملتا کیوں نہیں ہے، سقراط...؟ وہ... کیوں نہیں ملتا؟"

اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آئی تھی۔ آنکھوں میں نمی نہیں تھی مگر وہ ایسی ویران تھیں کہ آنسو بھی وہاں آنے سے ڈرتے ہوں۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اسکے ہونٹ نیلے پڑنے لگے۔ اس نے کرسی کی پشت پر سر گرا دیا۔ سقراط فوراً سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"تمہاری میڈیسن کہاں ہے؟"

حق نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"حق...!" سقراط نے کندھا ہلایا مگر حق اب اس کے سامنے موجود ہی نہیں تھا۔

اس کا ذہن... کہیں دور کا چکا تھا۔ ماضی کی بھول بھلیوں میں، یہ ایک روشن گرم کمرہ تھا۔ کھڑکی سے چاندنی اندر اتر رہی تھی۔ بستر پر تین وجود لیٹے تھے۔ ایک کنارے پر حازق گہری نیند سو رہا تھا۔ درمیان میں ماں (آصفہ سکندر) تھیں۔ اور ان کے بازو پر سر رکھے چھوٹا حق جاگ رہا تھا۔ ماں اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

"تم جانتے ہو..." انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔ "میں تمہیں الفا کیوں کہتی ہوں؟"

حق نے نفی میں سر ہلایا۔ ماں نے اس کی پیشانی چومی۔ "کیونکہ الفا حفاظت کرتا ہے۔" "تمہیں ہمیشہ حازق کی حفاظت کرنا ہوگی۔" انہوں نے سوتے ہوئے حازق کی طرف دیکھا۔

"تم چھوٹے ہو لیکن تمہیں بڑا بننا ہوگا۔" چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر انہوں نے دھیرے سے پوچھا۔ "حازق کے ساتھ رہو گے نا؟"

حق نے فوراً سر ہلا دیا۔ پھر کچھ سوچ کر آہستہ سے پوچھ بیٹھا۔

"ماما... آپ حازق سے زیادہ پیار کرتی ہیں یا مجھ سے؟"

سوال سنتے ہی آصفہ سکندر کے چہرے کی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔وہ خاموش ہوگئیں۔
حق نے دوبارہ پکارا۔

"ماما..."

اس بار اس کی آواز میں ضد نہیں صرف خوف تھا۔

"بتائیں نا...آپ زیادہ کس سے پیار کرتی ہیں؟"

ماں نے اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔بہت دیر تک کچھ نہ بول سکیں۔پھر دھیرے سے کہا۔

"یہ ضروری نہیں ہے،حق...ضروری صرف یہ ہے کہ تم ہمیشہ اپنے بھائی کا خیال رکھو۔"

انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے ننھے ہاتھ پر رکھ دیا۔"مجھ سے وعدہ کرو۔"

ننھے حق کی آنکھوں میں جیسے کانچ بھر گیا۔ اسے جواب مل گیا تھا...مگر وہ جواب نہیں تھا جو وہ سننا چاہتا تھا۔اس نے ہونٹ بھینچے اور خاموشی سے سر ہلا دیا۔

"وعدہ..."

ریستوران کے اس سنسان گوشے میں خاموشی اتری ہوئی تھی۔پھر ٹھک کی آواز ابھری۔حق نے پلکیں جھپکیں۔اس نے چونک کر سر اٹھایا۔اس کے سامنے گاڑی کی چابیاں پڑی تھیں،جو ابھی چند لمحے پہلے سقراط نے لاکر میز پر پھینکی تھیں۔

"تم ہمیشہ دواء گاڑی میں ہی کیوں رکھتے ہو؟"سقراط نے کرسی کھینچ کر دوبارہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سفید شیشی

تھی۔وہ چند لمحے پہلے خاموشی سے باہر گیا تھا،حق کی گاڑی کھولی اور ڈیش بورڈ سے یہ شیشی نکال لایا تھا۔
ڈھکن کھول کر اس نے بغیر کچھ کہے حق کا ہاتھ اپنی طرف کھینچا۔چند سفید گولیاں اس کی ہتھیلی پر انڈیل دیں۔

" کھاؤ..." یہ حکم تھا۔حق نے ایک لمحہ گولیوں کو دیکھا۔پھر بغیر کسی بحث کے انہیں منہ میں ڈال لیا۔سقراط نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔حق نے خاموشی سے پانی پیا۔شیشی واپس بند ہوئی۔میز پر رکھ دی گئی۔دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔حق نے ایک بار پھر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔آنکھیں بند کر لیں۔اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگا۔سقراط جانتا تھا یہ اس کے ساتھ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔اور وہ یہ بھی جانتا تھا...حق کو اس حالت سے نکلنے کے لیے نصیحتوں کی نہیں،صرف چند منٹوں کی خاموشی چاہیے ہوتی تھی۔
وقت خاموشی سے گزرتا رہا۔چائے کے کپ اپنی بھاپ کھو بیٹھے۔ریستوران میں صفائی کرنے والے ملازمین کی مدھم آہٹیں سنائی دینے لگیں۔کئی منٹ بعد...حق نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔
چہرے کی سفیدی کچھ کم ہو چکی تھی۔سانسیں ہموار تھیں۔وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
سقراط نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔اس نے ہاتھ اٹھا کر ویٹر کو اشارہ کیا۔

"دو چائے دوبارہ بنا دیجیے۔"

ویٹر نے خاموشی سے سر ہلایا اور چلا گیا۔سقراط نے دوبارہ حق کی طرف دیکھا۔

"اب ٹھیک ہو؟"

حق نے اس کی طرف دیکھا۔پھر ہولے سے مسکرایا۔

"ہاں۔"اس ایک لفظ میں معذرت بھی تھی اور شکر گزاری بھی۔سقراط کے منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

"اگلے مہینے تمہاری سالگرہ ہے۔وعدہ رہا بہت برا،برباد کروں گا۔"

سقراط نے کرسی پر بازو پھیلاتے ہوئے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔حق کے لبوں پر بے رنگ سی مسکراہٹ ابھری۔" کوشش کر لینا۔"

" کوشش؟" سقراط نے بھنویں چڑھائیں۔ "میں پوری تیاری سے آؤں گا۔"

اس بارحق کے ہونٹوں سے ایک مختصرسی ہنسی نکلی۔ چندلمحوں بعداس نے غیرمتوقع سنجیدگی سے پوچھا۔ " گفٹ کیا چاہیے؟"

سقراط خاموش ہوگیا۔اس نے میز پر پڑی چمچ انگلیوں میں گھمائی۔ پھرآہستہ سے پہلو بدلا۔

"جو مانگوں...دوگے؟"

حق کے چہرے سے مسکراہٹ یکسر غائب ہوگئی۔اس نے بغورسقراط کودیکھا۔وہ لہجہ...وہ سوال...بہت مانوس تھا۔

"بتاؤ۔" سقراط نے نظریں اس پر جمائے رکھیں۔ "دوگے؟"

حق کے گلے کی گلٹی آہستہ سے ابھری۔صرف ایک لمحے کے لیے...اس کے ذہن میں آصفہ سکندر کا چہرہ آیا۔جلدوہ جیل سے رہا ہونے والی تھیں۔اورحق اچھی طرح جانتا تھا۔سقراط کیا مانگنے والا ہے۔

"نہیں۔" لفظ مختصر تھا۔مگرلہجہ...پتھر جیسا سخت۔سقراط کے چہرے پر مایوسی تیرگئی۔

" کیوں؟ اتنا بھی اعتبارنہیں ہے مجھ پر؟"

حق نے نظریں جھکالیں۔ چند لمحے میز پرانگلی سے بے ترتیب لکیریں کھینچتا رہا۔پھر دھیرے سے بولا۔ "میں تمہیں کچھ اوردے سکتا ہوں۔"

سقراط نے بے دلی سے پانی کا گلاس اٹھایا۔ "مثلاً؟"

"تمہارے اورنجف کے بارے میں...داجی سے بات کرسکتا ہوں۔"

پانی سیدھا سقراط کے حلق میں اٹکا۔اچھولگا اور وہ زور سے کھانسنے لگا۔کچھ پانی اس کی شرٹ پر گرا، کچھ میز پر۔اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے حق کو دیکھا۔

" کیا بکواس کر رہے ہو؟" سقراط نے پانی کا گلاس آہستگی سے میز پر رکھ دیا۔اس کی انگلیوں میں ایک باریک سی کپکپاہٹ دوڑ گئی۔چہرے پر ایک لمحے میں کئی رنگ آئے اور چلے گئے۔وہ احساس...جسے وہ کئی مہینوں سے خود اپنے دل کے تاریک ترین کونے میں قید کیے بیٹھا تھا... آج کسی نے بے رحمی سے اس پر روشنی ڈال دی تھی۔حق اب پوری سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔اس کے چہرے پر شرارت کا شائبہ تک نہیں تھا۔

" تمہیں میں بے غیرت لگتا ہوں...؟" حق کی آواز معمول کے مطابق پُرسکون تھی،مگر اس میں ایسا کچھ تھا کہ سقراط کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہوئی۔

" تمہیں کیا لگتا ہے مُجھے پتا نہیں چلے گا کہ میرا دوست،میرے خاندان کی لڑکی کے بارے میں کیا سوچتا ہے؟"

سقراط جیسے ساکت رہ گیا۔اس نے نظریں چرائیں۔وہ پہلی بار حق کی آنکھوں میں دیکھنے سے گھبرایا۔اس کے حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے۔

" ت...تمہیں کیسے پتا چلا؟" آواز بمشکل نکلی۔

"مرد...اپنی عورتوں کی طرف اٹھنے والی ہر نظر پہچان لیتا ہے۔"

اسی لمحے ویٹر خاموشی سے تازہ چائے رکھ گیا۔کسی نے کچھ نہ کہا۔ویٹر کے قدموں کی آواز دور ہوتی گئی۔مگر سقراط کو یوں محسوس ہوا جیسے پوری دنیا اس کا راز سن چکی ہو۔اس نے نظریں جھکا لیں۔اپنے ہی احساسات پہلی بار اسے جرم لگ رہے تھے۔حق اسے دیکھ رہا تھا۔بغیر کسی فیصلے کے۔بغیر کسی نفرت کے۔صرف دیکھ رہا تھا۔پھر اس نے نہایت سادہ لہجے میں بولا۔

"ڈونٹ وری...مجھے تم پسند ہو۔"

سقراط نے فوراً سر اٹھایا۔حق نے چائے کا کپ میز اٹھاتے ہوئے بات مکمل کی۔

"نجف سے میرا رشتہ سوتیلا ہی سہی...لیکن خون کا ہے۔اگر وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے تو میرے خیال میں یہ بات گھر تک پہنچنی چاہیے۔"

"ن...نہیں...ایسی کوئی بات نہیں...تم غلط سمجھ رہے ہو۔"سقراط ہلکا گیا۔

حق نے بے نیازی سے ابرو اٹھائے۔

"جسے تم دل میں چھپاتے پھرتے ہو،وہ تمہاری آنکھوں سے عیاں ہوتا ہے۔"

سقراط کے کان تک سرخ ہو گئے۔اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

"شش...آہستہ بولو۔کوئی سن لے گا۔"

حق نے ہلکی سی گردن ٹیڑھی کی۔"تو سن لے۔"

"نہیں..."سقراط نے تڑپ کر کہا۔" کچھ احساسات...جتنے لوگوں تک پہنچ جائیں،اتنے سستے ہو جاتے ہیں۔"

"پھر انہیں سستا مت ہونے دو۔"حق نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"اپنی بھابھی سے کہو...رشتہ لے کر آئیں۔داجی سے میں بات کروں گا۔"

سقراط نے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔"میری بھابھی...تمہاری پھوپھو ہیں۔"

"لیکن اس وقت تمہاری بھابھی بھی ہیں۔" چند لمحے وہ خاموش بیٹھا رہا، پھر نہایت دھیرے سے بولا۔ "اگر انجام صاف ہوسکتا ہے...تو راستہ لمبا کیوں رکھا جائے؟"

"میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔" سقراط نے سانس گہری لی۔ اصل جملہ وہ کہہ نہ سکا۔ 'کہ میں ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا...' حق نے اس کی ادھوری بات بھی سن لی۔

"ہاں..." اس نے کپ اٹھاتے ہوئے چوٹ جی۔ "جیسے داجی تیار بیٹھے ہیں کہ کب سقراط شبگیر آئے اور کب وہ بیٹی اس کے حوالے کر دیں۔"

سقراط نے خفا نظروں سے اسے گھورا۔ "تم مذاق اڑا رہے ہو؟"

"نہیں۔" حق کا لہجہ بالکل سنجیدہ تھا۔ "میں حقیقت بتا رہا ہوں۔"

خاموشی چھا گئی۔ ریستوران کے باہر شام رات گہری ہو چکی تھی۔ شیشوں کے پار نظر آتا شہر جگمگا اٹھا تھا۔ حق نے کپ میز پر رکھا اور پھر آگے ہو بیٹھا۔

"سنو سقراط! اس رشتے کا کوئی حل نکالو۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میرا تمہارے ساتھ گھومنا تھوڑا مشکل ہو جائے گا۔ بہتر ہے تم دونوں کسی رشتے میں بندھ جاؤ۔"

"بات صرف میری نہیں ہے۔ اگر نجف مُجھے پسند ہی نہ کرتی ہو تو؟"

حق نے ایک لمحہ اسے دیکھا پھر ہلکی سی سانس خارج کی۔ "تو پتا کرو..." اس نے سنجیدگی سے کہتے اپنا فون اٹھا لیا۔ سقراط اسے دیکھ کر رہ گیا۔ دل چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ آج اسے جس بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا وہ شاید ہی اسے بھول پاتا۔ دو کپوں سے اٹھتی بھاپ آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہو رہی تھی...اور دو زندگیاں بھی، جنہیں ابھی خود معلوم نہیں تھا کہ وقت ان کے لیے کیا لکھ چکا تھا۔

☆...☆...☆

پندرہ دن گزر چکے تھے۔ پندرہ طویل اور بوجھل دن...سقراط نے ان پندرہ دنوں میں نجف سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کے سامنے آیا تھا۔مگر آج شام، جب وہ ہاکی کی پریکٹس سے فارغ ہو کر تھکا ہارا شبگیر ہاؤس میں داخل ہوا، تو لاؤنج میں معمول سے ہٹ کر ایک چہچہاتی ہوئی رونق لگی ہوئی تھی۔لاؤنج میں گھر کے تمام افراد موجود تھے اور کسی بات پر دلکش قہقہے گونج رہے تھے۔سقراط نے اپنے قدم روکے۔صوفے پر زہرہ بیگم کے پاس نجف اور نشاط دونوں بیٹھی تھیں۔سقراط نے ایک گہرا سانس لیا، اپنے اندر مچلتے جذبات کو چہرے پر لائے بغیر مشترکہ سلام کیا۔

"السلام علیکم! آج تو بڑے لوگ آئے ہیں..."

اس کا لہجہ ظاہر میں ہلکا پھلکا تھا، مگر اس کی نگاہیں دانستہ طور پر نجف کے وجود کو نظر انداز کر رہی تھیں۔نجف سیاہ رنگ کے سادہ مگر نفیس سوٹ میں ملبوس، جامنی دوپٹہ گلے میں ڈالے ہوئے تھی۔اس نے اپنا سر اٹھا کر سقراط کو دیکھا۔اس کی آنکھوں میں شدید الجھن تھی۔وہ پندرہ دنوں کے اس اچانک اور بے نام فاصلے کو سمجھنے سے قاصر تھی۔سقراط نہ اسکے کسی میسج کا جواب دے رہا تھا اور نہ ہی اس نے خود کوئی میسج کیا تھا۔
دوسری طرف نشاط نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی سقراط کا نجف کو دیکھنے سے گریز کرنا اور نجف کا سقراط کو الجھی نظروں سے تکنا...دونوں لمحوں میں محسوس کیا۔اس کے لبوں پر ایک باریک سی مسکراہٹ ابھری۔

"آؤ سقراط! بیٹھو بیٹا!" زہرہ بیگم نے پیار سے پکارا۔

"نہیں بھابھی...میں پہلے فریش ہو جاؤں۔" سقراط نے معذرت کی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، اس کے ذہن کے پردوں پر ماضی کے نقوش روشن ہونے لگے۔اسے وہ دن یاد آنے لگے جب وہ سب بچے تھے۔نجف اسے بچپن ہی سے ایک ان دیکھی سی کشش کے ساتھ اچھی لگتی تھی۔نیلوفر بیگم کو شبگیر ہاؤس سے شدید چڑ تھی اور وہ اپنی دونوں بچیوں کو یہاں بھیجنا پسند نہیں کرتی تھیں، مگر جب بھی آصفہ پھوپھو اپنے مائیکے آتیں۔عموماً وہ صرف ایک دن کے لیے آتیں تھیں۔حازق اور حق کے ساتھ نجف اور نشاط بھی ان کے ساتھ آجاتیں۔سارا دن بچوں کا شور و غوغا شبگیر ہاؤس کے در و دیوار میں گونجتا اور شام کو وہ واپس اپنے پیلس پلٹ جاتیں۔یوں جیسے دو شہزادے اور دو شہزادیاں راستہ بھٹک کر جنگل کے اس پار گاؤں میں آ گئے ہوں اور رات ہونے سے پہلے انہیں اپنے محل واپس لوٹنا ہو۔

سقراط کے لبوں پر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مسکراہٹ ابھری۔اس کے تصور میں بچپن کی نجف کا عکس لہرایا...جس کے بالوں کی پونیوں اور ہیئر کلپس پر اکثر رنگ برنگی تتلیاں بنی ہوتی تھیں۔وہ اور حق شریر بچوں کی طرح اکثر ان تتلیوں کو توڑ دیتے تھے اور نجف اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر زہرہ بیگم سے ان کی شکایت لگایا کرتی تھی۔

پھر ایک طوفان آیا اور سب کچھ تباہ ہو گیا۔آصفہ پھوپھو نے اپنے ہی شوہر کا قتل کر دیا...اور اس ایک خوفناک حادثے نے دونوں خاندانوں کے درمیان نفرتوں کی ایسی دیواریں کھڑی کر دیں کہ ہنستی کھیلتی بچپن کی وہ دنیا راکھ ہو گئی۔رشتے ٹوٹ گئے،آمدورفت ختم ہو گئی۔یہ تو اب سالوں بعد سقراط اور حق کی محکم دوستی تھی جس نے دھیرے دھیرے ان ٹوٹے ہوئے رشتوں کے زخموں پر مرہم رکھا تھا،اور ان دونوں لڑکوں کی وجہ سے لڑکیاں ایک بار پھر شبگیر ہاؤس آنے جانے لگی تھیں۔

"بچپن بھی کتنی جلدی گزر گیا...کچھ پتا ہی نہیں چلا۔"سقراط نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا پھر سر جھٹک کر اوپر چلا گیا۔تقریباً بیس منٹ بعد وہ فریش ہو کر،کپڑے تبدیل کر کے نیچے آیا۔ڈائننگ ایریا میں کھانے کی میز لگائی جا رہی تھی۔نشاط صوفے پر بیٹھی اپنے فون میں مصروف تھی جبکہ نجف زہرہ بیگم کے ساتھ مل کر سالن کے ڈونگے اور روٹیاں میز پر سجا رہی تھی۔سقراط نے نجف کی موجودگی کو مکمل طور پر نظر انداز کیا اور سیدھا جا کر نشاط کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اور نشاط... پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟"سقراط نے نشاط کی طرف رخ کر کے پوچھا۔نجف نے ڈائننگ ٹیبل پر پلیٹ رکھتے ہوئے سقراط کو دیکھا۔اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ ایک پل میں غائب ہو گئی۔نشاط نے فون ایک طرف رکھا اور سقراط کی طرف دیکھ کر چمکتی آنکھوں سے پوچھا۔

"پڑھائی کو چھوڑو،تمہیں میرا گفٹ کیسا لگا؟"

"بہت اچھا پرفیوم تھا۔دیکھو،میں نے ابھی بھی وہی لگا رکھا ہے۔"سقراط نے اپنی شرٹ کا کالر تھوڑا سا جھکا کر جواب دیا۔نشاط کے چہرے پر خوشی ابھری۔

"ہاں،سچ میں بہت اچھی خوشبو ہے۔"

نجف سے رہا نہ گیا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل سے تھوڑا قریب آئی اور خود ہی ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے مدہم، آس بھری آواز میں بولی۔

"اور...اور میرا گفٹ؟"

سقراط نے اپنا سر موڑا، مگر اس کی نظریں نجف کے چہرے پر ٹھہرنے کے بجائے اس کے شانے سے اوپر گزر گئیں۔ اس نے بے حد لاپروا انداز میں جواب دیا۔

" کیا تھا؟ سوری...میں بھول گیا۔"

نجف کے چہرے پر سایہ سا آ کر گزر گیا۔ اس کے لبوں سے بڑی مشکل سے الفاظ پھسلے۔

"وہ...ایک لاکٹ تھا۔" پھر اس نے ماحول کے اس بوجھل پن کو کم کرنے اور سقراط کی اس بے رخی پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"جب تمہاری شادی ہو جائے گی...تو اس میں اپنی بیوی کی تصویر لگانا۔"

سقراط کے چہرے کے تاثرات فوراً سخت ہو گئے۔ اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر قدرے خفگی سے کہا۔ "ایسے چونچلے نہیں کرتا میں!"

نجف نے ششدر اور حیرت زدہ ہو کر سقراط کا سخت چہرہ دیکھا۔ وہ ساکت رہ گئی۔ پھر اس نے بے یقینی کی حالت میں نشاط کی طرف دیکھا، شاید وہ سقراط کے اس غیر متوقع رویے کی کوئی وجہ بتائے، مگر نشاط نے محض لاپرواہی سے اپنے کندھے اچکا دیے۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتی، زہرہ بیگم نے سب کو کھانے کی آواز دی۔

کھانے کی میز پر بھی سقراط کا رویہ ذرا نہیں بدلا۔ وہ نجف کے بالکل بالمقابل بیٹھنے کے باوجود اسے مکمل طور پر نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ مسلسل نشاط سے باتیں کر رہا تھا۔ اسکے کالج، اس کے دوستوں اور اپنے ہاکی میچز کی باتیں...اور نشاط بھی بڑے چاؤ سے اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ سقراط کا یہ واضح فاصلہ، یہ سرد مہری اور روکھا پن نجف کے دل کو ہرٹ کر رہا تھا۔ اسے اسکی عادت نہیں تھی۔ وہ سقراط کو ہمیشہ اہمیت دیتی تھی

اور بدلے میں اسے بھی وہی اہمیت ملی تھی پھر اب اچانک کیا ہو گیا تھا؟ اس کی پلیٹ میں کھانا ویسے کا ویسا پڑا رہا، اس کا گلا رندھ گیا۔ مگر اس نے مزید کوئی بات نہیں کی۔

☆...☆...☆

بزدار فارماسیوٹیکل کی زیرِ زمین خفیہ لیبارٹری کا ماحول برفانی حد تک ٹھنڈا اور حبس زدہ تھا۔ زرد نیون روشنیوں تلے ایک لمبی سٹیل کی میز کے گرد چند سینئر فارماسیوٹیکل ڈاکٹرز، دوائیاں بنانے والے کیمیادان، بزدار اسپورٹس کالج کا ہیڈ کوچ، امجد بزدار اور ڈاکٹر شمس بزدار موجود تھے۔ ڈاکٹر شمس اس وقت بزدار اسپورٹس کالج کے ڈائریکٹر تھے۔ میز پر پانچ فی میل ایتھلیٹس کی میڈیکل فائلیں کھلی پڑی تھیں، جن پر سرخ رنگ سے Trial-01: Failed کی مہر لگی ہوئی تھی۔

"ہماری تمام تر حساب کتاب غلط ثابت ہوئی ہے۔" ایک سینئر کیمیادان نے پروجیکٹر پر پانچوں لڑکیوں کی میڈیکل رپورٹ پروجیکٹ کرتے ہوئے بوجھل آواز میں کہا، "یہ فارمولا جتنا طاقتور اور انقلابی لگتا تھا، اس کے نتائج اتنے ہی بھیانک نکلے ہیں۔"

امجد بزدار نے اپنے کوٹ کی جیب سے سگار نکال کر سلگایا۔ ان کے چہرے پر کوئی پشیمانی یا دکھ نہیں تھا، صرف ایک ناگواری تھی۔ "مُجھے تفصیلی رپورٹ چاہیے۔"

کیمیادان نے ایک گہرا سانس لیا اور فائل کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

"ہم نے اسپورٹس کالج کی اس بیچ کی پانچوں لڑکیوں کو Performance Enhancement Formula دینا شروع کیا تھا۔ ہم نے ان لڑکیوں اور ان کے گھر والوں کو یہی بتایا تھا کہ یہ وٹامنز، منرلز اور پروٹین کا ایک خاص امپورٹڈ امتزاج ہے جو ان کی برداشت اور انرجی کو بڑھائے گا۔ مگر حقیقت میں... یہ ایک انتہائی طاقتور Anabolic Androgenic Steroids اور ایک جدید تجرباتی ہارمونل کمپاؤنڈ (Experimental Hormonal Compound) کا آمیزہ تھا۔"

"ہمیں معلوم ہے کہ وہ کیا تھا!" شمس نے میز پر ہاتھ مار کر اسے ٹوکا، "مقصد یہ تھا کہ ان کی طاقت، عضلات کی مضبوطی، ریکوری کا وقت اور اسٹیمنا مردوں کے برابر لایا جائے تاکہ وہ نیشنل لیول پر گولڈ میڈل جیت سکیں۔ خرابی کہاں ہوئی؟"

"خرابی ویرلائزیشن (Virilization) میں ہوئی ہے۔" کیمیادان نے متنبہ کرنے والے انداز میں کہا، "خواتین کے جسم میں اینڈروجن کا یہ غیر معمولی اور حد سے زیادہ ڈوزان کے پورے ہارمونل سسٹم کو تباہ کر چکا ہے۔ یہ محض کوئی عارضی سائیڈ ایفیکٹ نہیں تھا...ہم نے انسانوں پر ایک ایسا تجربہ (Human Trial) کیا جس کے بھیانک نتائج اب خود ان لڑکیوں کے جسم سے ظاہر ہو رہے ہیں۔"

امجد بزدار کے لیے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں تھا لیکن اس طرح فیل ہونا ناقابل منظور تھا اور اسکی اجازت شمس نے دی تھی۔ لیب کے اندر ایک طویل اور بوجھل خاموشی چھا گئی۔ ہیڈ کوچ، جو پچھلے کچھ ہفتوں سے گراؤنڈ پر ان پانچوں لڑکیوں کو ٹریننگ دے رہا تھا، گھبرا کر آگے بڑھا۔

" کیمیادان بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ان پانچوں لڑکیوں کے جسم میں ایسی تبدیلیاں آ چکی ہیں کہ گراؤنڈ کا بقیہ سٹاف اور دوسرے سٹوڈنٹس بھی اب باتیں بنا رہے ہیں۔ ان کی آوازیں مردوں کی طرح بھاری ہو چکی ہیں...ان کے ماہواری کا سائیکل مکمل طور پر رک چکا ہے اور ان کی باڈی لینگویج...ان کے چلنے، بیٹھنے اور اٹھنے کا انداز بالکل ایک مرد جیسا ہو چکا ہے کیونکہ ان کا پٹھوں کا فریم اور مسل ماس مسخ ہو چکا ہے۔" کوچ نے پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے مزید بتایا۔

"ان کے رویے میں شدید جارحیت (Aggression) اور چڑچڑا پن آ چکا ہے۔ جب ہم نے شروع میں ان سے کہا تھا کہ یہ سب ایک عالمی لیول کا ایتھلیٹ بننے کی قیمت ہے تو وہ لڑکیاں خاموش رہیں۔ وہ سمجھیں کہ یہ سخت ٹریننگ کا نتیجہ ہے۔لیکن اب...اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ایک لڑکی کے گھر والوں نے اس کی یہ بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر اسے کالج سے اٹھا لیا ہے اور وہ اسے کسی صورت مزید کھیلوں میں نہیں بھیجنا چاہتے۔"

"ایک لڑکی کے جانے سے ہمارا راز افشا نہیں ہوگا۔" شمس بزدار نے نخوت سے کہا۔

"راز صرف وہاں تک محدود نہیں رہا، ڈاکٹر صاحب!" کوچ نے خوفزدہ ہو کر شمس کی بات کاٹی، "معاملہ اس سے کہیں زیادہ بھیانک ہو چکا ہے۔"

" کیا مطلب؟" امجد بزدار کے ابرو تنے۔

"پرسوں شام...جب میں اور ڈاکٹر شمس کالج کے ڈائریکٹر روم کے باہر راہداری میں اس دوا کے فارمولے اور لڑکیوں کے سائیڈ ایفیکٹس پر بات کر رہے تھے...تو ان پانچوں میں سے ایک لڑکی نے ہماری پوری گفتگو سن لی تھی۔"

لیب میں موجود تمام افراد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی۔

"اس نے سن لیا تھا کہ ہم وٹامنز کے نام پر انہیں زہر دے رہے تھے اور انہیں انسان کے بجائے ایک لیب چوہا بنا کر ڈرگز کا تجربہ کر رہے تھے۔" شمس بزدار کے چہرے پر تاریکی چھا گئی۔کوچ نے بات جاری رکھی۔

"وہ خاموشی سے وہاں سے نہیں گئی بلکہ میرے آفس آئی اور چیخ چیخ کر انصاف مانگا۔"
کوچ کے ذہن میں لڑکی کے جملے گونجے۔

"تم لوگوں نے ہم سے ہماری نسوانیت، ہماری صحت اور ہماری زندگی چھین لی ہے۔تم لوگ سپورٹس کے نام پر میڈیکل مافیا کا گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہو۔اگر تم نے یہ سب بند نہ کیا اور ہمارا علاج نہ کروایا، تو میں پوری دنیا کو، میڈیا کو اور پولیس کو بتاؤں گی کہ بزدار اسپورٹس کالج اور بزدار فارما کی اس لیب نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔میں تم سب کا اصلی چہرہ سب کے سامنے لاؤں گی۔"

امجد بزدار نے اپنا آدھا جلا ہوا سگار ایش ٹرے میں مسل کر بجھایا۔ان کے چہرے پر کسی ہمدردی کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔

"وہ لڑکی اب کہاں ہے؟" شمس نے حد درجہ ٹھنڈی آواز میں پوچھا۔

"وہ...وہ اپنے گھر میں ہے، مگر اس نے کل تک کا الٹی میٹم دیا ہے۔" کوچ نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔امجد بزدار نے میز پر پڑی اس لڑکی کی فائل اٹھائی، اس پر لگی تصویر کو دیکھا اور پھر فائل دھپ سے بند کر دی۔

"سائیڈ ایفیکٹس کو ریورس کرنے کی کیا تدبیر ہے؟ کیا کوئی اینٹی اینڈروجن یا ہارمونل بلاکر دیا جا سکتا ہے جس سے ان کا مسل ماس اور جسمانی ساخت واپس نارمل ہو جائے؟" وہ پرسوچ نگاہوں سے پروجیکٹر پہ نظر آتی لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔تجربے سے پہلے کی تصاویر اور بعد کی تصاویر میں فرق دیکھا جا سکتا تھا۔

ابھی ڈاکٹرز ہچکچاتے ہوئے اس کا جواب دینے ہی والے تھے کہ اچانک...ایک تیز، بے ہنگم آواز گونجنے لگی۔کمرے کے وسط میں پڑے ہیڈ کوچ کے فون کی اسکرین پر نوٹیفکیشنز کا طوفان آ گیا تھا۔فون لگاتار وائبریٹ کر رہا تھا اور اس کی اسکرین پر واٹس ایپ کے سینکڑوں میسجز کی متواتر پاپ اپ ونڈوز چمک رہی تھیں۔کوچ کا رنگ زرد پڑ گیا۔اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے فون اٹھایا۔

"س...سر!" کوچ کی آواز گلے میں اٹک گئی۔اس کی آنکھیں پھیلی کی پھیلی رہ گئیں، "تباہی ہوگئی سر...اس لڑکی نے...اس نے اسپورٹس کالج کے تمام آفیشل اور سٹوڈنٹ کلاس گروپس میں وائس نوٹس اور میڈیکل رپورٹ کے اسکرین شاٹس بھیج دیے ہیں۔"

کمرے میں موجود تمام افراد کا خون جم گیا، سوائے امجد بزدار کے۔

"اس نے پورا سچ لکھ دیا ہے۔" کوچ نے فون کی اسکرین دکھاتے ہوئے زہریلی سانس خارج کی، "اس نے لکھا ہے کہ بزدار فارما انہیں وٹامنز کے نام پر اسٹیرائڈز اور زہریلی ڈرگز دے رہا تھا۔طلبا میں یہ وائرل ہو چکا ہے...بچے ایک دوسرے کو فارورڈ کر رہے ہیں، کمنٹس آ رہے ہیں، بات انتظامیہ کے ہاتھ سے نکل رہی ہے۔"

لیبارٹری میں ایسی بھیانک اور دم گھوٹنے والی خاموشی چھا گئی جیسے کسی نے پورے کمرے کی آکسیجن چوس لی ہو۔اب وقت سدھارنے یا علاج کا نہیں رہا تھا۔پانی سر سے نہیں، چھت سے اوپر گزر چکا تھا۔سائیڈ ایفیکٹس کم کرنے کی گفتگو دم توڑ چکی تھی...اب یہ گناہ اور اس کے ثبوتوں کو مٹانے کا وقت تھا۔

امجد بزدار کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے۔انہوں نے اپنے سامنے بیٹھے فارماسیوٹیکل کے ماہر کیمیا دانوں اور ڈاکٹرز پر نظر دوڑائی۔ان کا لہجہ کسی خونخوار بھیڑیے کی طرح غُرّایا۔

"تم لوگ ہر سال بزدار فارما سے کروڑوں روپے کے فنڈز اور سلیریز کس لیے لیتے ہو؟" ان کی آواز سے لیب کی شیشے کی دیواریں لرز اٹھیں، "تمہیں پیسے اس لیے نہیں ملتے کہ تمہارے تجربات فیل ہوں۔میرے ایمپائر میں ناکامی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔اگر یہ ڈرگ فیل ہوئی تھی تو اس کا ثبوت اسی وقت ختم کیوں نہیں کیا گیا؟"

ڈاکٹر اور کیمیا دان مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے رہے۔ پھر امجد بزدار کا رخ اپنے بیٹے، شمس بزدار کی طرف ہوا۔

"تم نے اس فارمولے اور تجربے کے لیے پانچ جانوں کا رسک لیا، شمس...اور تمہاری اس غلطی کی وجہ سے میں اپنی اس فارماسیوٹیکل کی دنیا پر ایک داغ بھی برداشت نہیں کروں گا۔ کہانی اب ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ جو کیا ہے اسے سدھارو، ان لڑکیوں کا نام ونشان اس دنیا سے مٹ جانا چاہیے۔"

شمس نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ "جو حکم۔ بالکل ایسا ہی ہوگا۔"

شمس نے میز پر لگے ایک بٹن کو دبایا۔ کمرے کی مرکزی وال پر نصب بڑی ڈیجیٹل مانیٹر اسکرین کا پس منظر گہرے سرخ رنگ میں بدل گیا اور اس پر ان پانچوں فی میل ایتھلیٹس کا بائیو ڈیٹا اور فارماسیوٹیکل ہسٹری نمودار ہوئی۔

1. A - Areesha Tariq (آریشہ طارق)
2. L - Laiba Sohail (لائبہ سہیل)
3. P - Palwasha Khan (پلوشہ خان)
4. H - Hania Malik (ہانیہ ملک)
5. A - Anum Shah (انعم شاہ)

"ان پانچوں کے فون ڈس کنیکٹ کرو، ان کی لوکیشنز ٹریس کرو..." امجد بزدار نے اٹھتے ہوئے اپنا کوٹ درست کیا اور ٹھنڈے لہجے میں آخری حکم جاری کیا۔

"جتنا جلدی ہو سکے، اسپورٹس کالج کا یہ پروجیکٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تاریخ کے صفحے سے مٹا دیا جائے۔ کوئی گواہ، کوئی لاش اور کوئی میڈیکل ریکارڈ باقی نہ رہے۔"

شیشے کے پار، ٹیسٹ ٹیوبز میں ابلتے سرخ کیمیکلز پر نیون روشنی پڑ رہی تھی، اور ان پانچ لڑکیوں کے نام کے پہلے حرف سے اسکرین پر چمکتا ہوا لفظ ALPHA ایک ایسے بھیانک قتلِ عام کا پیش خیمہ بن چکا تھا جس کے شعلے آنے والے دنوں میں پورے بزدار پیلس کو اپنی

لپیٹ میں لینے والے تھے۔

☆...☆...☆

یہ اتوار کی ایک سست اور شاداب صبح تھی۔ شبگیر ہاؤس کے لاؤنج میں ایک خاص قسم کی چہل پہل اور رونق لگی ہوئی تھی۔ لانڈری سے واشنگ مشین کی مدہم، مسلسل آواز آ رہی تھی، لیکن فی الوقت گھر کی خواتین لاؤنج میں جمع تھیں۔ صوفے پر دادی گھٹنے پر ہاتھ رکھے براجمان تھیں اور ان کے بالکل قریب بے بی آنٹی بیٹھی تھیں۔ بے بی آنٹی دراصل شہر اور خاندانوں میں رشتے کروانے کے لیے مشہور تھیں۔ اس وقت ان کی گود میں چمکیلے لفافے اور لڑکیوں کی رنگ برنگی تصاویر کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا، جسے وہ باری باری دادی اور زہرہ بیگم کے سامنے پیش کر رہی تھیں۔ زہرہ بیگم بھی دادی کے ساتھ بڑی دلچسپی اور چاؤ سے تصویریں دیکھ رہی تھیں۔

"یہ دیکھیں اماں جی! یہ لڑکی ایم اے انگریزی ہے، قد بھی ماشاءاللہ پانچ فٹ پانچ انچ ہے۔"

بے بی آنٹی نے ایک تصویر دادی کی طرف بڑھائی۔ دادی نے اپنی عینک ناک کے پل پر ٹکائی، تصویر کو ذرا دور کر کے غور سے دیکھا اور منہ بسور کر بولیں۔ "یہ ایم اے انگریزی کا ہم نے کیا کرنا ہے؟ چائے بنانا اور سالن بھوننا آتا ہے اسے؟"

بے بی آنٹی نے جلی کٹی مسکراہٹ کے ساتھ دوسری تصویر نکالی۔ "اچھا یہ دیکھیں، یہ ڈاکٹر ہے۔ دیکھتی ہی آنکھوں میں بس جاتی ہے۔"

"سارا دن ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ رہے گی تو میرے سقراط کو وقت کیسے دے گی؟ ڈاکٹر تو آدھے پاگل ہوتے ہیں۔ کوئی گھریلو، سلیقہ مند لڑکی دکھاؤ بے بی!"

زہرہ بیگم مسکرا دیں۔ "اماں! آج کل کی لڑکیاں پڑھی لکھی ہی اچھی لگتی ہیں، سقراط کے ساتھ بھی تو کوئی سمجھدار جچنی چاہیے۔"

صوفے پر ایک کونے میں نیمل بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بائیو کی کتاب تھی مگر اس کی متجسس نظریں ہر بات، ہر تصویر اور سب کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسی اثنا میں سقراط سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ وہ آج کافی لیٹ اٹھا تھا۔ شاور لے کر، سیاہ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں فریش ہو کر وہ ناشتے کی تلاش میں کچن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زہرہ بیگم کی نظر اس پر پڑی تو وہ فوراً محبت سے

پکارا۔

"آؤ سقراط! تم بھی دیکھو آ کر...تمہارے لیے ہی تو لڑکیاں دیکھی جا رہی ہیں۔"

سقراط کے قدم وہیں جم گئے۔اس کے چہرے سے نیند اور سستی کی رمق ایک پل میں کافور ہوگئی اور اس کے تاثرات بدل کر بے زار اور تلخ ہو گئے۔اس نے زہرہ بیگم کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور سیدھا کچن میں گھس گیا۔اس نے فریج کا دروازہ جھٹکے سے کھولا، ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور بغیر گلاس ڈھونڈے، بوتل کو منہ لگا کر غٹا غٹ پانی پینے لگا۔اس کے گلے کی گلٹی اوپر نیچے ہو رہی تھی اور آنکھوں میں شدید کڑھن لہرا رہی تھی۔نیمل نے خاموشی سے سقراط کی کیفیت کو محسوس کر رہی تھی۔

"سقراط! کچن میں گھس کر کیا کر رہا ہے؟ باہر آ کر تصویریں تو دیکھ۔"دادی نے لاؤنج سے ہی پکارا۔

"ہاں بیٹا سقراط! باہر آؤ، ایک سے ایک چاند جیسی لڑکی ہے میرے پاس۔"بے بی آنٹی نے بھی لقمہ دیا۔

"مُجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔"سقراط نے کچن کے اندر سے ہی روکھے اور اکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔دادی نے تصویریں میز پر رکھیں اور ہنس کر بولیں۔

"لڑکی دیکھنے میں کیا حرج ہے؟ شادی کون سا آج ہی ہو رہی ہے۔بس پسند تو کر لے۔"

سقراط نے پانی کی بوتل کا ڈھکن سختی سے مروڑ کر بند کیا اور اسے فریج میں دھکیل دیا۔اس کا دل اندر سے بری طرح کڑھ رہا تھا۔اسے لگ رہا تھا جیسے سب مل کر اس کے اس زخم پر نمک چھڑک رہے ہوں، جو سالگرہ والے دن نجف اور اعظم کو ایک ساتھ دیکھ کر ہوا تھا۔لاؤنج میں بے بی آنٹی نے ایک اور تصویر زہرہ بیگم کے ہاتھ میں تھمائی۔

"یہ دیکھیں زہرہ، یہ تو بالکل اپسرا لگتی ہے۔نیک ہے غریب کی بیٹی ہے مگر تم لوگوں کے گھر آ کر راج کرے گی۔"زہرہ بیگم نے وہ تصویر دیکھی، پھر نیمل کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"نیمل! ذرا دیکھو تو... تمہیں کیسی لگتی ہے اپنے چاچو کے لیے؟"

نیمل نے اس تصویر کو ایک نظر دیکھے بغیر، اپنے سامنے بیٹھی تینوں عورتوں کو باری باری دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدہ تاثرات تھے۔

"آپ لوگ باہر رشتہ کیوں دیکھ رہے ہیں... جب گھر خاندان میں لڑکیاں موجود ہیں؟"

دادی، زہرہ بیگم اور بے بی آنٹی... تینوں نے حیرت سے بیک وقت اپنا رخ موڑ کر نیمل کو دیکھا۔

"کون سی لڑکیاں؟" دادی نے الجھ کر پوچھا۔

کچن کے دروازے کے پاس کھڑے سقراط کے بھی کان یکدم کھڑے ہو گئے۔ وہ اس وقت اپنے فون کی اسکرین پر نجف کے ایک ہفتہ پرانے میسجز دیکھ رہا تھا... جن کا اس نے آج تک کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"تم مجھ سے ناراض ہو؟"
"میری کوئی بات بری لگی ہے؟"

سقراط نے ان کا کوئی ریپلائے نہیں کیا تھا، اور پھر نجف نے بھی عزتِ نفس کے تحت مزید میسجز کرنا بند کر دیے تھے۔ ان کے درمیان ایک نامعلوم خاموشی کی دیوار کھڑی ہو چکی تھی۔ نیمل نے اپنی بوجھل آواز میں لاؤنج کے سکوت میں دھماکہ کیا۔

"نجف خالہ..."

کچن میں کھڑے سقراط کا دل دھک سے رہ گیا... اور اس کے ہاتھ سے فون گرتے گرتے بچا۔

"نجف؟" زہرہ بیگم کے لبوں سے بے اختیاری میں یہ نام زیرِ لب دہرایا گیا۔ جبکہ دادی کی پیشانی پر فوراً ناگواری کی ناگوار تیوریاں چڑھ گئیں۔

"ہاں نا امی! نجف خالہ کیوں نہیں ہوسکتیں؟" نیمل نے اپنی کتاب بند کرتے ہوئے سکون اور پختگی سے کہا، "اتنی اچھی تو ہیں اور پھر... چاچو اور خالہ ساتھ میں کتنے اچھے لگتے ہیں۔ دونوں کی آپس میں اتنی اچھی انڈر اسٹینڈنگ بھی ہے۔"

زہرہ بیگم کے چہرے پر سوچ کے گہرے سایے لہرانے لگے۔ نیمل کی بات بے بنیاد نہیں تھی، انہوں نے بھی ان دونوں کے درمیان ایک ان دیکھا، خاموش ربط محسوس کیا تھا۔ مگر زہرہ بیگم حقیقت پسند تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ نیلوفر بیگم غرور اور نفرت کی اس حد پر کھڑی تھیں جہاں وہ اپنی بیٹی کا شبگیر ہاؤس کی بہو بننا کبھی قبول نہ کرتیں۔ اور پھر نجف... وہ محلات اور شاہانہ آسائشوں میں پلنے والی لڑکی، کیا اس چھوٹے سے سادہ سے گھر میں گزارا کر پاتی؟ زہرہ بیگم نے بے ساختہ تشویش بھری نظروں سے کچن کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا، جہاں سقراط کا سایہ اب بھی ساکت تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو نیمل؟" دادی کا حلق جیسے زہر سے کڑوا ہو گیا، انہوں نے سخت لہجے میں نفی میں سر ہلایا، "سقراط اور نجف کا کیا جوڑ ہے؟"

"کیوں نہیں ہے جوڑ؟" نیمل نے ذرا سا آگے جھک کر معصومیت اور دلیل کے ساتھ بات رکھی، "جب تک نجف خالہ کی میڈیکل کی پڑھائی مکمل ہوگی، چاچو بھی اپنے کیریئر میں مکمل سیٹل ہو جائیں گے۔ لیکن امی... ہمیں رشتے کی بات ابھی سے کرنی ہوگی، ہے نا؟"

بے بی آنٹی نے اپنے چمکیلے لفافے سمیٹتے ہوئے نخوت اور تنک کر کہا۔ "ارے بھئی! جب گھر خاندان میں پہلے سے رشتہ طے شدہ موجود تھا، تو مُجھے صبح صبح یہاں کیوں بلایا؟ میرا وقت بھی ضائع کیا۔"

"ارے تم تصویریں دکھاؤ بے بی! چھوڑو اسے... یہ تو ابھی بچی ہے، اس کی باتوں میں کیا آنا۔" دادی نے اونچی آواز میں نیمل کو ڈانٹتے ہوئے بے بی آنٹی کو بہلایا۔

دادی کی وہ بلند اور کڑوی آواز کچن تک پہنچی تو سقراط کا ضبط جواب دے گیا۔ اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ بھاری قدموں کے ساتھ کچن سے باہر نکل آیا۔ لاؤنج کی تمام نظریں یکدم اس کے تپتے ہوئے چہرے پر جا ٹکیں۔

" کہا نا اماں !مجھے شادی نہیں کرنی۔"

سقراط کا لہجہ اتنا سپاٹ اور حتمی تھا کہ لاؤنج میں بیٹھی تینوں عورتیں دنگ رہ گئیں۔ پھر اس نے اپنی کٹھور نظریں بے بی آنٹی کی طرف موڑیں۔

"بے بی آنٹی! آپ اس گھر میں سو دفعہ آئیں...لیکن میرے رشتے کی بات لے کر آئندہ کبھی مت آیئے گا ورنہ آپ کو گیٹ سے ہی واپس جانا پڑے گا۔"

اس سے پہلے کہ دادی یا زہرہ بیگم کچھ بول پاتیں، وہ بے رخی اور سخت ناگواری سے پلٹا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا سیکنڈوں میں اپنے اوپر چلا گیا۔ اوپری لاؤنج کا دروازہ بند ہونے کی زوردار آواز گونجی۔ نیچے ایک بار پھر بوجھل اور دم گھوٹنے والا سناٹا چھا گیا۔ زہرہ بیگم کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کی گہری لکیریں ابھر آئیں۔ نیمل نے صوفے سے اٹھتے ہوئے باری باری دادی، زہرہ بیگم اور بے بی آنٹی کو دیکھا۔

"جس کے لیے لڑکی دیکھ رہے ہیں...ایک بار ان سے بھی تو پوچھ لیں کہ ان کے دل میں کیا ہے۔"

نیمل نے اپنی کتاب وہیں رکھی اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس کے قدم لانڈری کی جانب بڑھ گئے، جہاں سے واشنگ مشین کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں۔ پیچھے لاؤنج میں وہ تینوں خواتین بالکل خاموش اور ششدر بیٹھی رہ گئی تھیں۔ دادی کی گود میں پڑی رنگ برنگی تصویریں اب بے معنی لگ رہی تھیں، اور زہرہ بیگم کی نظریں اب بھی ان سیڑھیوں پر جمی تھیں جہاں سقراط اپنے دل کا غبار لیے جا چکا تھا۔

اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد اوپری لاؤنج میں دیوار پر لگی بڑی ایل ای ڈی اسکرین پر ہاکی کے کسی پرانے میچ کی ہائی لائٹس چل رہی تھیں، مگر صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا سقراط اسکرین کو گھورنے کے باوجود وہاں کچھ دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں بے حس تھیں اور ذہن ماضی اور حال کے تلخ جھمیلوں میں الجھا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں زہرہ بیگم ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے تھامے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئیں۔ انہوں نے ٹرے لا کر سقراط کے سامنے میز پر رکھی۔

"ناشتہ کر لو سقراط!" انہوں نے بے حد مان سے کہا۔

سقراط ایک دنیا رد کر سکتا تھا مگر زہرہ بیگم کا یہ مان اور محبت بھری التجا...اسے مسترد کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے ایک طویل سانس

بھری،صوفے سے اپنی لٹکتی ٹانگیں نیچے اتاریں اور ٹرے کو اپنی جانب کھینچ کر خاموشی سے روٹی کا نوالہ توڑ کر منہ میں ڈال لیا۔سادہ سے سوٹ میں ملبوس، کندھوں پر دوپٹہ پھیلائے زہرہ بیگم صوفے کے پہلو میں بیٹھ کر اسے بڑی غور اور شفقت سے دیکھ رہی تھیں۔روٹی کے نوالے سقراط کے خشک حلق سے اترنے کا نام نہیں لے رہے تھے، وہ محض ان کے مان رکھنے کے لیے زبردستی کھانا نگل رہا تھا۔سالگرہ والے اس تلخ دن کے بعد، وہ دوبارہ حق سے بھی نہیں ملا تھا۔ایک شدید پچھتاوا، ایک ان دیکھا بوجھ تھا جو اسے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔اس کا دل کڑھ رہا تھا۔وہ یوں ذلیل نہیں ہونا چاہتا تھا۔جب اس نے ایک روٹی بمشکل ختم کی اور پانی کا گلاس اٹھا کر چند گھونٹ پیے ،تو وہ اٹھ کر دھونے چلا گیا۔جب وہ واپس آ کر دوبارہ صوفے پر بیٹھا،تو زہرہ بیگم ایل ای ڈی کا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کر چکی تھیں۔ لاؤنج میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔سقراط ان کے سامنے اپنا سر جھکا کر بیٹھ گیا۔زہرہ بیگم اسے نہایت غور سے دیکھ رہی تھیں۔اس کے سر کے بھورے گھنے بال اور بالکل انہی بالوں کے ہم رنگ، گہری بھوری آنکھیں۔

"سلال دس سال بعد بالکل تمہارے جیسا دکھے گا،سقراط..."ان کی آواز میں دھیمی، پُرسکون مسکراہٹ تھی۔سقراط نے فوراً اپنی گردن اٹھا کر انہیں دیکھا، پھر اس کے سرد لبوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ ابھی۔

"وہ مجھ سے بہت بہترین انسان بنے گا، بھابھی!"

"تم بھی بہترین ہو۔"

زہرہ بیگم نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً کہا،تو سقراط کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا۔وہ دوبارہ خاموش ہو گیا۔وہ بوجھل خاموشی ایک بار پھر لاؤنج میں دونوں کو کاٹ کھانے کو دوڑنے لگی۔زہرہ بیگم نے ایک گہرا سانس لیا اور بالآخر وہی سوال پوچھا جو وہ نیچے لاؤنج کے واقعے کے بعد سے اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"تم نجف کو پسند کرتے ہو؟"

سقراط نے شدید ضبط سے اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں۔آہ! یہ محبت اسے اور کتنی بار ذلیل کروائے گی؟

"ایسی...ایسی کوئی بات نہیں ہے بھابھی!"وہ خود پر ضبط قائم کرتے ہوئے ،نظریں چُرا کر بولا۔زہرہ بیگم نے اس کے تنے ہوئے اعصاب،

بند آنکھوں اور چہرے کی بدلتی رنگت کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ اس کی اس نفی کے پیچھے چھپی اقرار کی چیخیں صاف سن سکتی تھیں۔

"یہ کافی مشکل کام ہے...لیکن میں اباجی سے بات کروں گی۔" زہرہ بیگم نے پختہ لہجے میں کہا۔ سقراط نے چونک کر اپنی گردن اٹھائی، اس کا پورا وجود ساکت ہو گیا۔

"بھا...بھی!" الفاظ جیسے دم توڑ گئے۔

"نہ تمہارے لیے رشتوں کی کمی ہے اور نہ نجف کو کبھی رشتوں کی کمی ہوگی...مگر یہ میری اپنے دل کی بھی خواہش ہے کہ وہ اس گھر کی بہو بنے اور..." زہرہ بیگم نے شفقت سے کہا۔

"اور...اور نجف کا کیا؟" سقراط نے تڑپ کر ان کی بات کاٹ دی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر سالگرہ کی اس شام کا منظر اور اعظم کا نجف کے ساتھ ہنستا ہوا چہرہ لہرایا، "کیا پتا...کیا پتا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو؟"

زہرہ بیگم ایک پل کے لیے بالکل خاموش ہو گئیں۔ یہ بات سچ تھی، وہ نجف کے دل کا حال نہیں جانتی تھیں۔

"اگر وہ کسی اور کو پسند نہ کرتی ہوئی...پھر؟" انہوں نے جانچتی اور گہری نگاہوں سے سقراط کو دیکھا، جو فوراً اپنی نظریں جھکا گیا۔

"چاند کی خواہش فضول ہے، بھابھی!" اس کے دل میں بوجھل پن اور حسرت اتری۔

"یہ سب تو نصیب کی بات ہے سقراط! اگر میں اس گھر میں بہو بن کر آسکتی ہوں...تو نجف بھی آسکتی ہے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی، باقی تمہاری قسمت..."

زہرہ بیگم نے ناشتے کی خالی ٹرے اٹھائی، پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ سقراط صوفے پر بیٹھا خاموشی سے انہیں نیچے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

قسمت...؟قسمت کا لکھا تو اپنی جگہ ٹھیک تھا،لیکن اس طلب کا کیا کرتا وہ؟ نجف کے ساتھ جینے کی اس طلب کا وہ کیا کرتا؟ وہ جتنا اس چاند سے دور بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا،اس کی روشنی اتنی ہی اس کے دل کے اندھیروں کو روشن کر رہی تھی۔

☆...☆...☆

یہ رات کی بات تھی۔سقراط دن بھر کی کوفت اور ذہنی تھکن کے بعد بستر پر بے سدھ سو رہا تھا،جب اچانک سائیڈ ٹیبل پر رکھے اس کے فون کی بے ہنگم گھنٹی نے کمرے کے سکوت کو توڑا۔ سقراط نے نیند میں دھندلاتی آنکھوں سے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا۔اسکرین پر خلیل کا نام چمک رہا تھا۔خلیل اس کی ہاکی ٹیم کا سینئر اور اہم پلیئر تھا۔سقراط نے بمشکل بیٹھتے ہوئے فون کان سے لگایا اور بھاری،غنودگی سے بھری آواز میں بولا۔

"ہاں خلیل...خیریت ہے؟اس وقت فون؟"

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا،صرف ایک دردناک سسکی سنائی دی۔خلیل کا سانس بری طرح پھول رہا تھا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

"سقراط...سقراط!میری...میری بہن..." خلیل کی آواز بھرائی ہوئی تھی،"سقراط!میری بہن نے خودکشی کر لی۔"

یہ جملہ سننا تھا کہ سقراط ایک شدید جھٹکے سے بستر سے اٹھ بیٹھا۔نیند کا نام ونشان ایک پل میں کافور ہو گیا۔اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ہانیہ ملک!ہانیہ ملک،خلیل ملک کی چھوٹی بہن تھی...اور وہ انہی پانچ لڑکیوں میں سے ایک تھی جن پر بزدار اسپورٹس کالج اور بزدار فارماسیوٹیکل نے اس مہلک،تجرباتی ڈرگ کا تجربہ کیا تھا۔پچھلا ایک ہفتہ اسپورٹس کالج اور ان پانچوں لڑکیوں کے لیے ایک بھیانک کابوس ثابت ہوا تھا۔ پہلے پہل بزدار فارماسیوٹیکل اور کالج کی انتظامیہ نے اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کیا۔انہوں نے ان پانچوں لڑکیوں اور ان کے گھر والوں کو لاکھوں روپے کی بھاری رقم اور خاموش رہنے کا معاوضہ آفر کیا تھا تاکہ وہ اپنا منہ بند رکھیں اور میڈیکل رپورٹ میڈیا تک نہ پہنچائیں۔مگر وہ لڑکیاں ضمیر فروش نہیں تھیں۔انہوں نے کالج کے منہ پر وہ رقم مار کر اپنے ساتھ ہوئے اس ظلم کے خلاف انصاف مانگنے کا اعلان کر دیا تھا۔ہانیہ ملک کی منگنی طے ہو چکی تھی،مگر ہارمونل دوا کے سائیڈ ایفیکٹس کے باعث جب اس کی جسمانی ساخت بدل چکی تھی۔آواز بھاری ہوئی اور چہرے پر بال اگ آئے،تو اس کے سسرال والوں نے بغیر کچھ سنے اس کی منگنی توڑ دی۔ہانیہ کے لیے یہ صدمہ ہی کم نہیں تھا کہ پچھلے صرف سات دنوں کے اندر اندر اس کے گروپ کی تین دیگر لڑکیاں پراسرار اور

بھیانک موت ماری گئیں۔آریشہ طارق جس کا کار حادثے میں گاڑی کا بریک فیل ہونے سے دردناک ایکسیڈنٹ ہوااوروہ موقع پر دم توڑ گئی۔لائبہ سہیل جس کے گھر میں رات کے اندھیرے میں اچانک سلنڈر پھٹنے سے آگ لگی اوروہ جھلس کر ماردی گئی۔پلوشہ خان شدید ہارمونل اٹیک کے بعد ہسپتال منتقل کی گئی اوروہاں پراسرارطور پراس کا سانس بند ہوگیا۔ہانیہ سمجھ چکی تھی کہ یہ حادثات نہیں بلکہ سفاکانہ قتل تھے۔وہ اوراس کا بھائی خلیل خوف اورصدمے کی شدید حالت میں تھے۔ہانیہ کومعلوم تھا کہ اس کا نمبر بھی آنے والا ہے۔تنہائی، مایوسی اور اپنے تباہ ہوتے وجود کے تنگ آ کر، ہانیہ نے ایک آخری اورخوفناک قدم اٹھایا۔خودکشی کرنے سے چند لمحے پہلے،اس نے اپنے موبائل سے ایک تفصیلی اعترافی ویڈیوریکارڈ کی اوراسے کسی طرح بزدارا سپورٹس کالج کے سٹوڈنٹ پورٹل پراپ لوڈ کردیا۔اس ویڈیو اس نے رورو کر بتایا کہ وٹامنز کے نام پرانہیں کس طرح لیب کے چوہے بنا کراینابولک اسٹیرائیڈز دیے گئے۔اورویڈیو کے بالکل آخر میں،اس نے پانچویں لڑکی،انعم شاہ کا نام لے کراسے وارن کیا۔

"انعم! بھاگ جاؤ...یہ لوگ ہمیں ایک ایک کر کے ماررہے ہیں۔میں جارہی ہوں،لیکن تم اپنی جان بچا کر کہیں دور بھاگ جاؤ۔"

رات کے ساڑھے تین بجے سقراط،خلیل کے گھر کے باہر موجود تھا۔گلی میں پولیس کی سرخ اور نیلی بتیوں والی گاڑیاں کھڑی تھیں۔گھر کے اندر سے خلیل کی ماں اور بہنوں کے بین کرنے کی دلدوز آوازیں آرہی تھیں۔لاؤنج میں پولیس اہلکار،تفتیشی افسراورخلیل کے رشتہ دار جمع تھے۔سقراط کا چہرہ زرداورآنکھیں سرخ تھیں۔وہ خلیل کے قریب کھڑا، پولیس افسر کے فون پر ہانیہ کی وہی آخری ویڈیو دیکھ رہا تھا۔
اگرچہ بزدارا سپورٹس کالج کے آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ نے آدھے گھنٹے کے اندراندروہ ویڈیواپنی ویب سائٹ سے ڈیلیٹ کردی تھی مگرتب تک دیرہوچکی تھی۔سینکڑوں طلبانے وہ ویڈیوڈاؤنلوڈ کرلی تھی اوروہ واٹس ایپ گروپس اورسوشل میڈیا پرجنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی،خبروں کے نیوزچینلز پردھماکے دار بریکنگ نیوز چلنا شروع ہوگئیں۔

"بزدارا سپورٹس کالج کا میڈیکل اسکینڈل! طالبہ ہانیہ ملک کی خودکشی...مرنے سے قبل بزدارفارما پرسنگین الزامات کی ویڈیووائرل!"

دن کے اجالے میں، پولیس کی ایک خصوصی ٹیم پانچویں اورآخری زندہ بچ جانے والی لڑکی،نعم شاہ کے گھر چھاپہ مارنے اوراسے تحفظ فراہم کرنے پہنچی۔مگروہاں پہنچ کر پولیس کا سامنا ایک اورہولناک حقیقت سے ہوا۔انعم شاہ کے گھر میں ماتم کا سماں تھا۔وہ غائب ہوچکی تھی۔
چند گھنٹوں کے اندراندر،اسے یا تو زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔انعم کی ماں دروازے کی چوکھٹ پرسر پیٹتی ہوئی،زاروقطاررو کرتفتیشی افسر کو بتارہی تھی۔

"میری بیٹی کہیں نہیں گئی...صبح صبح اسے فون آیا تھا۔اس نے مجھ سے کہا کہ امی! باہر گلی کے موڑ پر میرا کوئی پارسل آیا ہے، میں بس دومنٹ میں لے کر آتی ہوں...وہ چپل پہن کر باہر گئی تھی اور پھر...پھر وہ کبھی واپس نہیں آئی۔میری بچی کو بچالو۔"

انعم شاہ کا فون مسلسل سوئچ آف آرہا تھا۔جہاں سے وہ غائب ہوئی تھی وہاں کوئی کیمرہ نہیں تھا۔باقی کیمروں میں وہ موڑ کی طرف جاتے ہوئے نظر آرہی تھی۔

بزدار اسپورٹس کالج اور بزدار فارما کی طرف سے ابھی تک کوئی بھی سرکاری یا قانونی بیان جاری نہیں ہوا تھا۔ڈائریکٹر شمس بزدار اپنے وکیلوں کی فوج کے ساتھ اپنے محلات میں چھپ چکے تھے۔باہر سڑکوں پر عوام اور اسپورٹس کالج کے مشتعل طلباء کا ایک سمندر امڈ آیا تھا۔ہانیہ ملک سمیت ان پانچوں ناکام تجربے کی قربانی بننے والی لڑکیوں کے لیے انصاف کے نعرے گونج رہے تھے۔مگر انصاف اتنا سستا کب تھا جو یونہی مل جاتا؟

پچھلے دس گیارہ سالوں کے اس خونی اور ماضی کی داستان پر پہنچ کر...رتق نے اپنے تمام تر سحر زدہ اور رازدارانہ دروازے آہستہ سے بند کر لیے اور وقت کی بے رحم گردش ہمیں ایک بار پھر حال کی تلخ اور جلی ہوئی حقیقتوں میں واپس لے آئی۔

☆...☆...☆

جمعے کی شام آہستہ آہستہ بزدار ہسپتال کی عمارتوں پر اتر رہی تھی۔دن بھر کی ہلچل کے بعد ہسپتال کا سبزہ زار نسبتاً خاموش ہو چکا تھا۔دور کہیں کسی وارڈ کی کھڑکی سے مدھم روشنی باہر آرہی تھی، جبکہ نیلی عمارت کی بلند دیوار کے پیچھے سورج اپنا آخری کنارہ سمیٹ رہا تھا۔ہوا میں شام کی خنکی بڑھ گئی تھی۔نجف اور سقراط چند قدم کے فاصلے پر آمنے سامنے کھڑے تھے۔دونوں کے لباس سفید تھے۔اتنے سادہ کہ آج کے دن کے لیے بھی ان میں شادی کا کوئی نمایاں رنگ نہیں تھا۔جیسے یہ نکاح بھی ان کی زندگی میں کسی خوشی کی طرح نہیں، کسی ضرورت کی طرح آیا ہو۔نجف نے اپنا سفید دوپٹہ دونوں کندھوں کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ایک جانب کی مانگ سے نکلے ہوئے اس کے بال ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ گالوں کو چھو رہے تھے۔وہ بار بار انہیں کان کے پیچھے کرنے کی کوشش کرتی، مگر چند لمحوں بعد کوئی ضدی سی لٹ پھر ہوا کے ساتھ اس کے چہرے پر آجاتی۔وہ گردن اٹھائے سقراط کو دیکھ رہی تھی۔سقراط نے سینے پر بازو باندھ رکھے تھے۔اس کا سر قدرے جھکا ہوا تھا اور نگاہیں نجف کے چہرے پر جمی تھیں۔چہرہ سپاٹ تھا، مگر آنکھوں میں ایک عجیب سی سردی تھی۔وہ دونوں آج ہی ایک رشتے میں بندھے تھے۔اور دونوں کے درمیان ایک لمحے کے لیے بھی اپنائیت نہیں اتری تھی۔نجف نے خاموشی توڑی۔

"ہمیں ایک بات ابھی طے کر لینی چاہیے۔"

سقراط نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نجف نے لہجہ کو مزید سخت بنایا۔

"ہماری دشمنی اپنی جگہ ہے۔ ہماری نفرت اپنی جگہ۔ جو کچھ دس سال پہلے ہوا...وہ بھی اپنی جگہ۔" ایک لمحے کو اس کی آواز رکی۔ "لیکن خاندان کو ہماری وجہ سے مزید کسی مسئلے کا سامنا نہیں ہونا چاہیے۔"

"میرے خیال میں تمہیں یہ بات مجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں۔" سقراط نے کندھے اچکائے۔

"مُجھے ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ میں تمہیں جانتی ہوں۔"

سقراط کی بھنویں ذرا سی اٹھیں۔ "اور جیسے میں تمہیں نہیں جانتا؟"

"جانتے ہو۔" نجف نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ ہم دونوں اس نکاح کو نہیں چاہتے۔"

"صحیح..."

"ہم دونوں اس رشتے کو قبول بھی نہیں کرتے۔"

"صحیح..."

"تو پھر اسے نبھانے کا ڈرامہ بھی نہیں کریں گے۔"

سقراط کی نگاہ میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔"مُجھے ڈرامے پسند نہیں۔"

"مُجھے بھی نہیں۔" نجف نے ایک لمحے کو سانس اندر کھینچی۔"لیکن لوگوں کے سامنے ایک دوسرے کی عزت رکھیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

" گھر والوں کے سامنے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اور کوئی بھی بات ایسی نہیں ہوگی جس سے زہرہ آپا کو ہماری وجہ سے تکلیف پہنچے۔"

اس بار سقراط نے جواب دینے میں چند لمحے لیے۔زہرہ بیگم کا نام آتے ہی اس کے چہرے کی سختی ایک لمحے کو نرم پڑی۔"اس میں تمہیں مجھ پر شک نہیں ہونا چاہیے۔"

نجف خاموش ہوگئی۔وہ جانتی تھی۔سقراط کے بارے میں دنیا کچھ بھی کہے،زہرہ آپا کے لیے اس کے دل میں جو مقام تھا،اس پر اسے کبھی شک نہیں ہوا تھا۔

"ایک اور بات۔ہم ایک دوسرے کی ذاتی زندگی میں دخل نہیں دیں گے۔"

سقراط کی نگاہ اس کے چہرے پر ٹھہر گئی۔مغرور ناک اور جھلستی ہوئی آنکھیں۔"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم کہاں جاتے ہو،کس سے ملتے ہو،کس سے بات کرتے ہو...مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔اور میری زندگی میں بھی تمہارا کوئی سوال نہیں ہوگا۔"

سقراط نے چند لمحے اسے دیکھا۔"منظور ہے۔"

نجف کو شاید اس جواب کی اتنی آسانی کی توقع نہیں تھی۔اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"اچھا۔تو پھر ایک آخری اصول..."

"ابھی ختم نہیں ہوا؟" سقراط کو کوفت ہوئی۔

"یہ سب سے اہم ہے۔" وہ ایک قدم آگے بڑھی۔سر اٹھا کر سقراط کی آنکھوں میں دیکھا۔

"جب تک یہ رشتہ قائم ہے،ہم ایک دوسرے کی ذاتی زندگی سے مکمل طور پر دور رہیں گے۔کوئی حق جتانا نہیں۔کوئی سوال نہیں۔کوئی توقع نہیں۔"

سقراط نے اسے خاموشی سے دیکھا۔"اور اگر کبھی یہ رشتہ ختم کرنا پڑا؟"

"تو وہ بھی ہم دونوں کی مرضی سے ہوگا۔" ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔نجف کے بال پھر اس کے چہرے پر بکھر گئے۔اس نے انہیں پیچھے کیا اور پھر اپنے ہاتھ کو چند لمحے دیکھا۔پھر سقراط کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

"ڈیل؟"

سقراط کی نگاہ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر پڑی۔پھر اس کے چہرے پر۔وہ چند لمحے بالکل ساکت رہا۔نجف کا ہاتھ ہوا میں ٹھہرا رہا۔اسے لگا شاید وہ ہاتھ نہیں ملائے گا۔
مگر اگلے ہی لمحے سقراط نے سینے سے بندھے بازو کھولے۔اس کا ہاتھ آہستہ سے آگے بڑھا۔اور اس کی انگلیاں نجف کی انگلیوں سے جا ملیں۔ایک لمحہ۔صرف ایک لمحہ۔پھر...نجف کی سانس رک گئی۔اس کی انگلیوں میں جیسے اچانک جان نہیں رہی۔ایک...دو...تین... اگلے ہی لمحے اس کے پورے وجود میں جیسے بجلی کا ایک تیز جھٹکا دوڑ گیا۔

نہیں۔ یہ محض لمس نہیں تھا۔ یہ وہی تھا۔ وہی احساس۔ وہی وجود۔ وہی حصار...نجف کی آنکھیں یکا یک پھیل گئیں۔ اس کے سامنے موجود سبزہ زار دھندلا گیا۔ شام کی ہوا غائب ہوگئی۔ ہسپتال کی عمارتیں، درخت، راستے، سب جیسے کسی نے ایک ہی لمحے میں اس کے سامنے سے ہٹا دیے۔ اور پھر...ایک خواب۔ وہی خواب۔ وہی خوفناک منظر جس نے اس کی نیند چھین رکھی تھی۔ وہ کسی کے حصار میں تھی۔ کسی ایسے مرد کے حصار میں جس کے وجود سے اسے نفرت تھی۔ لیکن یہ کیا؟ وہ مسکرا رہی تھی وہ مرد بھی مسکرا رہا تھا۔ وہ ایک پرفیکٹ کپل تھا۔ نجف کے چہرے کا رنگ یکا یک اڑ گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ سقراط نے حیرت سے اسے دیکھا۔ نجف کی سانسیں بے ترتیب ہو چکی تھیں۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ وہی ہاتھ...جسے ابھی چند لمحے پہلے اس نے ایک معمولی سی ڈیل کے لیے آگے بڑھایا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی انگلیوں میں ابھی تک وہ لمس موجود ہو۔ وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی۔ پھر دوسرا۔ اس نے چاروں جانب دیکھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی ہسپتال۔ وہی شام۔ وہی سبزہ زار۔ مگر نجف کے لیے سب کچھ بدل چکا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟"

سقراط کی آواز اسے واپس کھینچ لائی۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ ایسی آنکھوں سے جیسے پہلی بار اسے دیکھ رہی ہو۔ سقراط نے اس کے چہرے پر پھیلی دہشت کو سمجھنے کی کوشش کی۔

"تم ٹھیک ہو؟"

نجف کے ہونٹ ہلے، مگر آواز نہ نکلی۔ سقراط نے چند لمحے اسے دیکھا۔ پھر شاید اسے لگا کہ اسے کچھ وقت چاہیے۔ اس نے اپنے لہجے کو معمول پر لاتے ہوئے کہا۔

"فکر مت کرو۔ میں تمہاری شرطوں کا احترام کروں گا۔"

نجف کچھ نہ بولی۔ وہ چند لمحے رکا۔ پھر اپنا رخ موڑ لیا۔ اور وہ چل پڑا۔ نجف کی نظریں اس کی پشت پر جم گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ سبزہ زار سے نکلتا ہوا ہسپتال کی راہداری کی طرف بڑھا۔ ایک لمحے بعد وہ راہداری کے موڑ پر پہنچا۔ پھر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ مگر نجف وہیں کھڑی رہی۔ ساکت۔ بے حس۔ اس کی نظریں اب بھی اسی جگہ جمی تھیں جہاں سقراط آخری بار دکھائی دیا تھا۔ پھر اس نے دوبارہ اپنے دائیں ہاتھ کو

دیکھا۔اس کی انگلیاں ہلکی ہلکی کانپ رہی تھیں۔اس نے ہاتھ اپنے سینے سے لگالیا۔دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر آجائے گا۔اوراس لمحے نجف کو اپنے خواب سے زیادہ خوف اس حقیقت سے محسوس ہوا تھا کہ شاید وہ خواب تھا ہی نہیں۔شاید وہ کسی آنے والے واقعے کی جھلک تھا۔اور اگر ایسا تھا...تو پھر اس نے آج اپنے خواب کے اس شخص سے نکاح کر لیا تھا۔

☆...☆...☆

بزدار پیلس کی شام معمول کے مطابق خاموش تھی۔اتنی خاموش کہ کبھی کبھی اس وسیع عمارت میں چلتے ہوئے اپنے ہی قدموں کی چاپ اجنبی محسوس ہوتی تھی۔حق اپنی اسٹڈی میں اکیلا بیٹھا تھا۔سامنے میز پر کھلی ہوئی چند فائلیں،ایک طرف لیپ ٹاپ اور میز کے کونے پر پڑا وہ چھوٹا سا کی پیڈ فون تھا جسے اس نے جانے کتنے دنوں سے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔آج اس نے وہ فون دوبارہ نکال لیا تھا۔وہ فون اس کی زندگی کا ایک ایسا دروازہ تھا جسے وہ عام دنوں میں بند ہی رکھنا پسند کرتا تھا۔مگر آج...اسے کھولنے کے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ فون اچانک بج اٹھا۔اسکرین پر وہی نامعلوم،پرائیویٹ نمبر تھا۔حق کی انگلیاں ایک لمحے کو رکیں۔پھر اس نے فون اٹھایا۔

"ہیلو؟" دوسری جانب چند ثانیے خاموشی رہی۔پھر وہی آواز ابھری۔

"آپ کو ایک خبر دینی تھی،بزدار صاحب۔"

حق کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔"بولو..."

"آپ کی بیوی کی جان کو خطرہ ہے۔"

حق جیسے کرسی سے اٹھتے اٹھتے رک گیا۔"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

اس کی آواز بلند ہوئی۔دوسری طرف موجود شخص کی آواز بدستور پرسکون تھی۔

"آپ کولگتا ہے یہ ایجنسی ہم نے بکواس کرنے کے لیے بنائی ہے؟"

حق کے جبڑے بھنچ گئے۔اس نے میز کے کنارے پر ہاتھ جما دیا۔

"تفصیل سے بتاؤ..."وہ یک دم مظرب ہوا۔

"فی الحال اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ خطرہ حقیقی ہے۔"

"کس طرف سے؟"حق نے بے چینی سے پوچھا "کون ہے؟"پر کوئی بھی جواب نہیں آیا۔

"ہو سکے تو اپنی بیوی کو گھر پر رکھیں۔"

حق نے ضبط سے آنکھیں میچ لیں۔"مُجھے بتاو..."

ٹوں...ٹوں...ٹوں...کی آواز گونجی۔

"ہیلو..."وہ دبا دبا سا غرایا مگر لائن کٹ چکی تھی۔اس نے فوراً نمبر ملایا۔ایک بار پھر دوسری بار۔پھر تیسری بار۔ہر مرتبہ وہی خاموشی منتظر تھی۔ کال مل ہی نہیں رہی تھی۔اس نے فون آہستہ سے نیچے کیا۔اس کے سینے میں دل غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔وہ چند لمحے اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔پھر اس نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبا سانس لیا۔ایک...دو...تین...اس نے اپنے اعصاب کو قابو میں کیا۔وہ حق تھا۔ اسے گھبرانے کا حق نہیں تھا۔اس نے فون واپس میز کی دراز میں رکھا،دراز بند کی اور اسٹڈی سے باہر نکل آیا۔مگر اس بار اس کے قدموں میں وہ معمول کی ٹھہری ہوئی سنجیدگی نہیں تھی۔عجیب سی بے چینی تھی۔وہ سلویٰ کو تلاش کر رہا تھا۔

راہداری عبور کرتے ہوئے اس کی نظریں مسلسل ادھر ادھر اٹھ رہی تھیں۔اس نے کمرے میں دیکھا،لان میں بھی...وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دی۔پھر وہ کامل کے کمرے کے سامنے پہنچا۔اس نے بغیر دستک دیے دروازہ کھولا۔سامنے سلویٰ بیٹھی تھی۔وہ کامل کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا رہی تھی جبکہ آیا چند قدم پیچھے کھڑی تھی۔

کامل کی معصوم آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔حق کے لب کھلے۔وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔مگر اگلے ہی لمحے اس کی نگاہ کامل پر پڑی۔اس ننھے

وجود کے سامنے وہ کچھ بولنے کی ہمت نہ کر سکا۔

"پا... پا..." کامل اسے دیکھ کر خوشی سے مسکرایا۔حق نے چہرے پہ زبردستی مسکراہٹ سجائی پھر اس نے خاموشی سے دروازہ واپس بند کر دیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی اس نے اپنا سر لکڑی سے ٹکا دیا۔ایک لمحے کے لیے آنکھیں موند لیں۔اس کے سر میں جیسے شور بھر گیا تھا۔وہ آواز بار بار ذہن میں گونجنے لگی۔

"آپ کی بیوی کی جان کو خطرہ ہے۔"

حق نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اور گہری سانس لی۔اسے اپنی بے چینی پر غصہ آ رہا تھا۔وہ خطرے کو سمجھنے والا آدمی تھا۔خطرہ اگر نا معلوم ہو تو وہ اسے اور بھی زیادہ خطرناک سمجھتا تھا۔مگر یہاں مسئلہ صرف ایک نا معلوم خطرہ نہیں تھا۔مسئلہ سلویٰ تھی۔اور کامل۔اور اس کا پورا گھر۔اس سے پہلے وہ کچھ سوچتا راہداری کے دوسرے سرے سے ایک ملازم آتا دکھائی دیا۔

"صاحب۔" حق فوراً سیدھا ہو گیا۔ملازم قریب آ کر رک گیا۔

"بڑے صاحب آپ کو اپنی اسٹڈی میں بلا رہے ہیں۔"

حق کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے سختی سی ابھری۔"اس وقت؟"

"جی صاحب!" ملازم نے اسی مؤدبانہ انداز میں کہا۔حق نے چند ثانیے کچھ نہیں کہا۔پھر نہایت مختصر انداز میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔"

ملازم پلٹ گیا۔حق وہیں کھڑا رہا۔اس نے ایک بار کامل کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔پھر اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔اس کے اندر ایک عجیب سا احساس ابھر رہا تھا۔
جیسے آج کی رات کسی معمول کی رات کا آغاز نہ ہو۔چند لمحوں بعد اس نے اپنے چہرے پر وہی بے تاثر سنجیدگی واپس اوڑھ لی۔پھر وہ چل

پڑا۔ بزدار پیلس کے دائیں حصے سے نکل کر وہ اس شیشے کے پل کی طرف بڑھا جو محل کے دونوں حصوں کو آپس میں جوڑتا تھا۔ پل کے نیچے باغ کی روشنیاں دھندلی پڑ رہی تھیں۔ شیشے کی دیواروں پر اس کا عکس اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ایک سنجیدہ، مضبوط اور بظاہر بے فکر مرد کا عکس۔ مگر آج اس عکس کی آنکھوں میں بھی بے چینی تھی۔ حق نے چلتے ہوئے ایک بار پل کے شیشے سے باہر دیکھا۔ پھر نظریں سامنے جما دیں۔ پل کے دوسرے سرے پر نیلوفر بیگم کا حصہ شروع ہو رہا تھا۔ وہاں ہمیشہ کی طرح خاموشی تھی۔ حق نے آخری چند قدم بھی اسی سکون سے اٹھائے جیسے اسے ابھی کچھ دیر پہلے اپنی بیوی کی جان کو لاحق خطرے کی خبر ملی ہی نہ ہو۔ مگر اس کے ذہن میں ایک سوال مسلسل گونج رہا تھا۔

اگر خطرہ واقعی تھا... تو کس سے؟ اور اس سے بھی بڑا سوال یہ تھا کہ اس ایجنسی کو پہلے سے کیسے معلوم تھا کہ خطرہ سلویٰ تک پہنچ رہا ہے؟ بزدار پیلس کے دوسرے حصے میں امجد بزدار کی اسٹڈی ہمیشہ کی طرح نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ امجد بزدار اپنی بڑی میز کے پیچھے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے اخبار کھلا تھا، مگر پچھلے کئی منٹ سے اس کا ایک صفحہ بھی نہیں پلٹا تھا۔ ان کا مزاج گزشتہ چند دنوں سے بگڑا ہوا تھا۔ آج نجف نے ان کی مرضی کے خلاف جا کر نکاح کیا تھا اور انہوں نے اسے روکا نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ زہرہ کی حالت نے انہیں مجبور کر دیا تھا، شاید اس لیے کہ نجف کو وہ ایک بار پھر بستر مرگ پہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر اس فیصلے نے ان کے اندر ایک خاموش غصہ ضرور چھوڑ دیا تھا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ امجد بزدار نے نظریں اٹھائیں۔ دروازہ کھلا اور حق اندر داخل ہوا۔

"السلام علیکم!" حق نے چند قدم آگے بڑھ کر ان کے سامنے رکھی کرسی سنبھال لی۔

"وعلیکم السلام۔" امجد بزدار نے کچھ لمحے اسے دیکھا۔ کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر امجد بزدار نے میز پر رکھی ایک فائل بند کر دی۔

"مسٹر خان کا فون آیا تھا۔"

حق کے چہرے کے تاثرات ایک دم سپاٹ ہو گئے۔ وہ خاموش رہا۔ امجد بزدار نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ تم اور سلویٰ ڈائیورس چاہتے ہو؟"

حق کی نظریں ایک لمحے کے لیے میز پر پڑے قلم پر ٹھہریں۔ پھر اس نے نہایت سکون سے کہا۔ "میں ایسا نہیں چاہتا۔"

امجد بزدار کی بھنویں ہلکی سی بلند ہوئیں۔"تو پھر؟"

"یہ سلویٰ کی خواہش ہے۔"

"اور تم؟"

حق نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔"میں اس کی خواہش کے خلاف اسے کب تک روک سکتا ہوں؟"

امجد بزدار کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ان کی انگلیاں میز پر ایک مخصوص ترتیب سے بجنے لگیں۔ٹک...ٹک...ٹک...پھر وہ رک گئیں۔

"تمہیں اندازہ ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟اس خاندان میں آج تک کسی کی طلاق نہیں ہوئی۔"

حق خاموش رہا۔

"کبھی کسی نے یہ لفظ اس گھر کی چار دیواری کے اندر نہیں بولا۔"امجد بزدار کی آواز اب پہلے سے بھاری تھی۔"اور تم چاہتے ہو کہ یہ سب تم سے شروع ہو؟"

حق کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔"میں ایک نارمل زندگی جینا چاہتا ہوں داجی!اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ...میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔"

"لیکن سلویٰ تو کچھ اور چاہتی ہے۔"وہ تیزی سے بولے۔

حق نے اس بار جواب دینے میں چند لمحے لیے۔"میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ کسی کی زندگی زبردستی نہ بنائی جائے۔"

امجد بزدار کی آنکھوں میں ناگواری کی ایک لکیر ابھری۔"زندگی صرف اپنی مرضی سے نہیں چلتی، حق۔" انہوں نے کرسی سے قدرے آگے جھکتے ہوئے کہا۔"تم نے اس گھر میں آنکھ کھولی ہے۔تم جانتے ہو خاندان کیا ہوتا ہے۔نام کیا ہوتا ہے۔عزت کیا ہوتی ہے۔"

حق خاموش بیٹھا رہا۔امجد بزدار نے گہرا سانس لیا۔

"جو سالوں پہلے ہوا...میں نہیں چاہتا وہ دوبارہ ہو۔"

اس بار حق کی نظریں ان کے چہرے پر اٹھیں۔امجد بزدار کی آواز میں ماضی کی تلخی اتر آئی تھی۔

"اس خاندان میں کبھی کسی کی طلاق نہیں ہوئی۔تمہاری ماں نے تمہارے باپ کا قتل کیا تھا..."

حق کے چہرے پر ایک لمحے کو سختی آئی، مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔وہ جبڑے بھینچے بیٹھا رہا۔

"اس ایک حادثے نے اس خاندان کو جو نقصان دیا، جو بدنامی دی...اسے ہم نے برسوں بھگتا ہے۔"امجد بزدار کے لہجے میں غصے سے زیادہ خوف تھا۔"میں نہیں چاہتا وہ کہانی پھر دہرائی جائے۔"

خاموشی۔گہری اور بھاری۔حق نے اپنے دونوں ہاتھ آپس میں جوڑ لیے۔"داجی..."

"نہیں۔پہلے میری بات سنو۔"امجد بزدار نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔

"تم جانتے ہو ٹوٹے ہوئے خاندان کے بچے کس اذیت سے گزرتے ہیں۔"

حق کی پلکیں ہلکی سی لرزیں۔ہونٹ کپکپائے۔

"تم جانتے ہو ایک بچے کے لیے ماں باپ کا الگ ہونا صرف دو لوگوں کا فیصلہ نہیں ہوتا۔اس کے بعد اس کی پوری دنیا بدل جاتی ہے۔"

امجد بزدار کی آواز اب نرم پڑ گئی۔یہی نرمی ان کے الفاظ کو زیادہ خطرناک بنا رہی تھی۔"میں نہیں چاہتا تمہاری یا سلویٰ کی وجہ سے کامل کو یہ سب جھیلنا پڑے۔"

حق کا چہرہ یکا یک بدل گیا۔امجد بزدار نے بات جاری رکھی۔

"میں نہیں چاہتا کہ وہ حازق..."

"کامل میرا بیٹا ہے،داجی۔" حق نے پہلی بار ان کی بات کاٹ دی۔اس کی آواز بلند نہیں تھی۔مگر اس میں ایسی سرد قطعیت تھی کہ امجد بزدار کے الفاظ وہیں رک گئے۔
حق نے آہستہ سے نظریں اٹھائیں۔اس کی نیلی آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔

"کامل،حق بزدار کا بیٹا ہے۔اور میں اپنے بیٹے کو وہ زندگی نہیں دوں گا جو میں نے جی ہے۔"

امجد بزدار خاموش ہو گئے۔حق نے نظریں نہیں ہٹائیں۔وہ انہیں دیکھتا رہا۔اس کے لہجے میں شکایت نہیں تھی۔کوئی چیخ نہیں تھی۔صرف ایک فیصلہ تھا۔ایسا فیصلہ جسے وہ برسوں پہلے اپنے اندر دفن کر چکا تھا۔امجد بزدار نے اسے چند لمحوں تک دیکھا۔
پھر بوجھل سانس خارج کی۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ کرسی پہ پیچھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"تم اپنے خاندان کے لیے وہ کرو گے جو ضروری ہوگا۔جو ہمیشہ کیا ہے۔"

حق نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"لیکن اس مسئلے کا جلد کوئی حل نکالو۔" انہوں نے میز پر پڑی فائل دوبارہ کھولی۔
"الیکشن کے دن قریب ہیں۔" ان کا لہجہ دوبارہ سیاسی اور حسابی ہو گیا۔ "میں نہیں چاہتا تمہاری ذاتی زندگی کا کوئی معاملہ، حکمت اور اس کی پارٹی کے لیے مسئلہ بنے۔"

حق نے سر ہلایا۔ وہ اٹھنے لگا تھا کہ ان کی آواز دوبارہ گونجی۔

"زہرہ کی حالت کیسی ہے؟"

اس سوال پر حق کے چہرے کی سختی قدرے ڈھیلی پڑی۔ "ابھی خطرے سے باہر نہیں ہیں۔"

امجد بزدار کی نظریں چند لمحوں کے لیے جھک گئیں۔ "اور نجف؟"

"ہسپتال میں ہی ہے۔" حق نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اس نے اپنی مرضی کر لی۔" اب وہ زخمی نظر آتے تھے۔ "لیکن زہرہ کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

حق خاموش رہا۔ کچھ لمحے پہلے تک جو شخص خاندان کی عزت، طلاق اور سیاست کی بات کر رہا تھا... اس ایک جملے میں اچانک ایک باپ اور ایک عمر رسیدہ انسان دکھائی دیا تھا۔ حق آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ امجد بزدار کی آواز عقب سے ابھری۔

"حق۔" وہ رک گیا۔ "جو بھی کرنا... سوچ سمجھ کر کرنا۔"

حق نے چند لمحے خاموشی سے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"میں ہمیشہ سوچ سمجھ کر ہی کرتا ہوں، داجی۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ امجد بزدار اکیلے رہ گئے۔ میز پر پھیلی فائلیں، انتخابات کی تاریخیں، سیاسی حساب کتاب... سب اپنی جگہ موجود تھا۔ مگر ان کی نگاہ اب کسی کاغذ پر نہیں تھی۔ وہ صرف بند دروازے کو

دیکھ رہے تھے۔

☆...☆...☆

رات کافی ڈھل چکی تھی۔شبگیر ہاؤس ک لاؤنج میں معمول کی چہل پہل سمٹ کر خاموشی میں بدل چکی تھی۔صرف دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک اور کبھی کبھار کمرے کے اندر سے پنسل کے کاغذ پر چلنے کی مدہم آواز سنائی دے رہی تھی۔سقراط صوفے پر بیٹھا تھا۔شکن زدہ سفید لباس اب بھی ویسا ہی تھا جس میں، دن کے وقت اس نے نکاح کیا تھا۔دن بھر کی تھکن اس کے چہرے پر صاف تھی، مگر اس کی پشت اب بھی سیدھی تھی۔نامرہ کچن سے پانی کا گلاس لے کر آئی۔اس نے گلاس میز پر رکھنے کے بجائے اس کی طرف بڑھا دیا۔سقراط نے گلاس لے لیا۔

"شکریہ۔"

نامرہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔اس کے چہرے پر فکر صاف لکھی تھی۔

"امی کی طبیعت کیسی ہے؟"

سقراط نے گلاس کے کنارے سے ایک گھونٹ لیا۔"پہلے سے بہتر ہے۔"

نامرہ نے سر ہلا دیا۔اس کی نظریں سقراط کے چہرے پر ٹھہری تھیں، جیسے وہ اس کے اندر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔سامنے والا کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔اندر تارہ اور نوفہ قالین پہ بیٹھیں اپنے اسکول کا ہوم ورک کر رہی تھیں۔دونوں وقفے وقفے سے اپنی نظریں لاؤنج کی طرف اٹھا رہی تھیں۔صوفے کے دوسرے سرے پر دادی بیٹھی تھیں۔وہ جانے کب سے رو رہی تھیں۔دوپٹے کے پلو سے بار بار آنکھیں صاف کرتیں، پھر آنسو دوبارہ بہنے لگتے۔آخر کار انہوں نے سقراط کو دیکھا۔

"میری بات سن لو، سقراط۔"

سقراط نے نگاہ اٹھائی۔دادی کی آواز رندھ گئی۔

"وہ لڑکی اس گھر میں نہیں آئے گی۔"

چند لمحوں تک سقراط خاموش رہا۔پھر اس نے بالکل سادہ لہجے میں پوچھا۔

"تو اور کہاں جائے گی؟"

دادی نے اسے خفا نظروں سے دیکھا۔

"میری بلا سے! چولہے میں جائے۔مُجھے کیا؟"

سقراط نے ہلکی سی سانس خارج کی۔"ہوں۔" پھر اس نے گلاس میز پر رکھا۔

"وہ میری بیوی ہے،اماں۔"

بیوی کے لفظ پر اس نے خاصا زور دیا۔دادی جیسے ایک لمحے کو رونا بھول گئیں۔نامرہ کی نظریں بھی فوراً سقراط کے چہرے پر جم گئیں۔سقراط نے دادی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"عورت اپنے مرد کے گھر ہی آتی ہے۔جو مرد کا گھر، وہی اسکی عورت کا گھر!"

دادی واقعی رونا بھول چکی تھیں۔نامرہ ساکت ہوئی اور اندر کا پی پہ چلتیں تارہ اور نوفہ کی پنسلیں بھی رک گئیں۔

"اگر آپ یہ کہہ دیں کہ یہ گھر میرا نہیں ہے...تو پھر میں اسے یہاں نہیں لاؤں گا۔"

دادی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "تم...تم اس لڑکی کے لیے اپنی ماں سے لڑو گے؟"

"میں آپ سے لڑ نہیں رہا۔"

"تو کیا کر رہے ہو؟"

"حقیقت بتا رہا ہوں۔"

دادی نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "تمہیں تو نفرت تھی نا اس سے..."

سقراط کا چہرہ بدستور سپاٹ رہا۔ "یہ بات آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔"

"تو پھر نکاح کیوں کیا؟" سوال فضا میں ٹھہر گیا۔ سقراط چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

"زہرہ بھابھی کے لیے۔"

"تو پھر اسے اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہو؟" دادی کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔

" کیونکہ نکاح ہو گیا ہے۔" سقراط نے آہستہ سے سر اٹھایا۔

"وہ تمہیں کبھی قبول نہیں کرے گی۔"

"مُجھے معلوم ہے۔"

"وہ تم سے نفرت کرتی ہے۔"

سقراط کے ہونٹ ایک لمحے کو بھنچے۔ "یہ بھی معلوم ہے۔"

"پھر؟"

"پھر اب وہ میری بیوی ہے۔" اس نے دادی کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ نامرہ کے ہاتھ میں خالی ٹرے ہلکی سی لرزی۔ دادی نے جیسے اپنے آنسوؤں کے درمیان کوئی ایسی بات سن لی تھی جس کے لیے وہ تیار نہیں تھیں۔

"تم آج بھی اسے پسند کرتے ہو؟"

سوال اچانک نکلا۔ لاؤنج کی فضا جیسے منجمد ہوگئی۔ سقراط کی پلکیں ایک لمحے کو اٹھیں۔
نامرہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ مگر سقراط نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف چند لمحے بعد نظریں چرا کر میز پر رکھے پانی کے گلاس کو دیکھا۔

"آپ غلط سوچ رہی ہیں اماں!"

"میں تمہیں جانتی ہوں، سقراط! تم جس چیز کو اپنا مان لو، پھر دنیا تمہیں اس سے الگ نہیں کر سکتی۔"

"ہر رشتہ آدمی کو خوشی دینے کے لیے نہیں ہوتا، اماں۔ کچھ رشتے آدمی کو اپنا فیصلہ نبھانے کے لیے ملتے ہیں۔" سقراط کے چہرے پر سی تھکن ابھری۔ دادی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"تم بہت بدل گئے ہو، سقراط۔"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ اس نے صوفے کی پشت سے سر ٹکایا۔

"آپ واقعی خالہ کو یہاں لائیں گے؟" نامرہ نے آہستہ سے پوچھا، سقراط نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سختی نہیں تھی۔

"اگر وہ خود آنا چاہیں گی تو۔"

نامرہ کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ دادی نے فوراً منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
مگر سقراط نے انہیں دیکھا اور بہت دھیرے سے کہا۔

"اور اماں..." وہ رک گیا۔ دادی نے آنکھیں اٹھائیں۔ "اگر وہ یہاں آنا چاہے تو پھر آپ کو اسے قبول کرنا ہوگا۔"

دادی کے ہونٹ کپکپائے مگر وہ کچھ بول نہیں پائیں۔ سقراط اٹھ کھڑا ہوا اور واپس ڈائننگ ہال سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ چند قدم بعد دادی کی آواز ابھری۔

"اور اگر میں نے اسے قبول نہ کیا تو؟"

سقراط رک گیا۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ صرف چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔

"تو مُجھے دو لوگوں میں سے کسی ایک کو چننا پڑے گا۔"

دادی کے حلق میں کچھ اٹک سا گیا۔ سقراط نے آہستہ سے رخ موڑا۔

"اور اماں... میں یہ نہیں جانتا کہ آپ مُجھے کس طرف کھڑا دیکھنا چاہتی ہیں۔"

وہ مزید کچھ کہے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دادی وہیں بیٹھی رہ گئیں۔ نامرہ نے خاموشی سے انہیں دیکھا۔ اور کھلے دروازے کے پیچھے نوفہ اور تارہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کی سرگوشیاں شروع ہو چکی تھیں۔ کھسر پھسر کی آواز اب لاؤنج تک آ رہی تھی۔ دادی جیسے کسی بھیانک خواب سے جاگیں۔

"ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ وہ یہاں نہیں آئے گی۔" ان کی لرزتی ہوئی بلند آواز لاؤنج میں گونجی۔ "آج تمہارا باپ زندہ ہوتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا مُجھے..." وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے مسلسل رو رہی تھیں۔

"میرا باپ زندہ ہوتا تو آج حالات مختلف ہوتے۔" سیڑھیاں چڑھتے سقراط نے تلخی سے سوچا۔ نامرہ ٹرے میز پہ رکھتے ہوئے ان کی جانب بڑھی۔

"دادی...دادی پلیز...روئیں مت۔" نامرہ نے ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

"ہٹو پیچھے...جانتی ہوں میں تمہیں بھی..." دادی نے اسکے بازو جھٹکے۔ نامرہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "اسکے لائے ہوئے تحفے تو دیدے پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں تم...تب تمہیں دادی کا خیال نہیں آیا؟" دادی کچھ نہیں بھولتی تھیں۔ نامرہ کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"دادی..." نامرہ نے محبت سے انہیں گلے میں واپس بانہیں ڈال دیں۔ "میں نے بس دیکھے تھے...آپ کی قسم! میں نے ان میں سے کچھ نہیں لیا۔" نامرہ نے تڑپ کر اپنی صفائی دی۔

"ہاں تو دیکھے کیوں؟" دادی کی آواز رندھ گئی۔

"اب نہیں دیکھوں گی پکا..." نامرہ نے انہیں خود میں بھینچ لیا۔ "بے فکر رہیں دادی آپ کی لیلی آپ کے ساتھ ہے۔" وہ انہیں دلاسہ دے رہی تھی جبکہ سقراط سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو لاؤنج میں بیٹھا چغلی خان پھڑ پھڑا کر اڑا۔

"شیر...شیر...شادی...شادی..." وہ اڑتا ہوا سقراط کی جانب آیا۔ سقراط نے گہرا سانس لیا۔ چلو کسی کو تو شادی کی خوشی تھی۔

☆...☆...☆

رات ہسپتال کی دیواروں پر آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ کارڈیک بلاک کے ایک نسبتاً خاموش کمرے میں زہرہ بیگم نیم دراز تھیں۔ مانیٹر کی ہلکی

ہلکی بیپ، آکسیجن کی مدھم آواز اور باہر سے گزرتے قدموں کی چاپ کے سوا کمرے میں کوئی آواز نہیں تھی۔
نیمل نے پانی کا گلاس ایک طرف رکھا اور احتیاط سے زہرہ بیگم کو دوا دی۔ پھر ان کے تکیے درست کیے اور کمبل ان کے سینے تک کھینچ دیا۔ اس کے ہاتھوں پر لگی مہندی اب اپنی شوخی کھو چکی تھی۔ انگلیوں کے پوروں تک پھیلا ہوا مٹیالا رنگ جیسے کئی دنوں سے دھلے ہوئے غم کی طرح لگتا تھا۔ چہرہ بھی ویسا ہی تھا، تھکا ہوا۔ زہرہ بیگم اسے خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ وہ ماں تھیں۔ بیٹی کے چہرے پر چھپی ہوئی ایک ایک بات پڑھ سکتی تھیں۔ نیمل نے کمبل کا آخری کونا درست کیا اور مصنوعی سی مسکراہٹ کے ساتھ سیدھی ہوئی۔

"بس امی، اب آپ آرام کریں۔"

زہرہ بیگم کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

"تم ٹھیک ہو، نیمل؟"

ایک لمحے کے لیے نیمل کی مسکراہٹ رکی۔ پھر وہ پہلے سے زیادہ خوش دلی سے مسکرائی۔

"جی امی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

زہرہ بیگم کی آنکھوں میں ایک خاموش اداسی اتری۔ وہ جانتی تھیں۔ بہت کچھ ایسا تھا جو نیمل ان سے چھپا رہی تھی۔

"اور نجف؟"

"میں نے انہیں گھر جانے کا کہا ہے۔" نیمل نے کرسی پیچھے کرتے ہوئے کہا، "بس نکل رہی ہوں گی۔"

"اکیلے؟"

"جی۔"

"سقراط کہاں ہے؟ وہ چھوڑ آتا..."

"چاچو چلے گئے ہیں امی! دادی کی طبعیت تھوڑی خراب تھی۔ نامرہ نے فون آیا تھا، وہ اس لیے چلے گئے۔"

نیمل نے مسکرا کر جواب دیا، مگر اس بار اس کی آواز پہلے جیسی مضبوط نہیں تھی۔ زہرہ بیگم نے اپنا ہاتھ کمبل سے باہر نکالا۔

"ادھر آؤ۔"

نیمل فوراً قریب آئی اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔ زہرہ بیگم کی انگلیاں اس کی انگلیوں میں بند ہو گئیں۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

الفاظ بہت سادہ تھے۔ مگر لہجہ ایسا تھا جیسے وہ نیمل کو نہیں، خود اپنے دل کو یقین دلا رہی ہوں۔ نیمل کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے فوراً سر جھکا لیا تا کہ ماں اس کی آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔

"جی امی..." اس نے زہرہ بیگم کے ہاتھ کو ذرا مضبوطی سے تھاما۔ "ان شاءاللہ... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

کمرے میں پھر خاموشی اتر آئی۔ شیشے کی بڑی کھڑکی کے پار ہسپتال کی روشن راہداریاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک طرف ماں بیٹی ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں۔ اور دوسری طرف... وقت اپنی رفتار بدل چکا تھا۔ راہداری کی روشنیاں پیچھے چھوٹتی گئیں۔ کارڈیک بلاک کی خاموشی سے نکل کر وقت تیزی سے میڈیکل بلاک کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاں نجف موجود تھی۔ وہ ایک مریضہ کی فائل ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ پچیس سالہ وہ لڑکی شادی شدہ تھی۔ عمر کم تھی، مگر بیماری نے اس کے چہرے پر ایسی تھکن اتار دی تھی جو کبھی کبھی عمر سے بہت پہلے آ جاتی ہے۔ نجف نے نہایت اطمینان سے اس کا معائنہ مکمل کیا۔

"فی الحال وائیٹل سائنز بہتر ہیں، لیکن انہیں آبزرویشن میں رکھیں۔" اس نے فائل نرس کی طرف بڑھائی۔ "اور یہ والی دوا وقت پر دینی

ہے۔کوئی ڈوزمس نہیں ہونی چاہیے۔"

"جی،ڈاکٹر۔"

نجف نے دوبارہ مریضہ کی طرف دیکھا۔اس کے چہرے پر پیشہ ورانہ سکون تھا۔ہسپتال کا تقریباً ہر فرد آج کے غیر معمولی واقعے سے واقف تھا۔آج اسی ہسپتال میں ایک نکاح ہوا تھا۔ہسپتال کی سی ایم اوصاحبہ کا نکاح بھی ہسپتال میں ہوا تھا۔اوراب جب بھی کوئی نجف کو دیکھتا، مبارک باد دیے بغیر نہیں رہتا تھا۔مریضہ نے کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھا۔پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"آپ کی شادی ہوگئی ہے؟"

نجف چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔"جی؟"

لڑکی نے مسکرا کر دوبارہ کہا،"آج ہوئی ہے نا آپ کی؟" نجف کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت آئی۔پھر اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"بہت بہت مبارک ہو۔"لڑکی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی نرمی تھی۔"اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔"

"شکریہ۔"نجف کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔بس اتنا ہی کہہ سکی۔
اللہ خوش رکھے۔کیا خوشی واقعی اتنی آسان تھی؟اس نے فوراً اس خیال کو جھٹک دیا۔وہ دوبارہ مریضہ کی طرف متوجہ ہوئی۔وہ ذرا جھکی۔اس کی انگلیاں مریضہ کی کلائی تک پہنچیں۔نبض کے لمس کے لیے اس نے جیسے ہی انگلیاں اس کی جلد پر رکھیں... سب کچھ بدل گیا۔ایک لمحہ۔ صرف ایک لمحہ۔جیسے کسی نے دنیا کی تمام آوازیں اچانک بند کر دی ہوں۔اندھیرا۔گھپ اندھیرا۔اتنا گہرا کہ اس میں کوئی شکل نہیں تھی۔ کوئی راستہ نہیں۔کوئی آواز نہیں۔بس اندھیرا تھا۔ ایک جھٹکا اس کے پورے جسم سے گزرا۔اس نے فوراً مریضہ کی کلائی چھوڑ دی۔

"ڈاکٹر؟"

نرس کی آواز بہت دور سے آئی۔ نجف نے سانس کھینچنے کی کوشش کی۔ اس کے سینے میں ہوا جیسے اٹک گئی تھی۔

"ڈاکٹر، آپ ٹھیک ہیں؟"

اس نے پلکیں جھپکیں۔ کمرہ واپس اپنی جگہ آ گیا تھا۔ سفید دیواریں۔ بیڈ۔ نرس سورمریضہ۔ مگر نجف کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ اس نے بے یقینی سے مریضہ کو دیکھا۔ وہ لڑکی نیم دراز تھی۔ خالی خالی آنکھوں سے نجف کو دیکھ رہی تھی۔ اور حیرت انگیز طور پر مسکرا رہی تھی۔ نجف کے اندر کچھ مزید سکڑ گیا۔

"ہاں... میں ٹھیک ہوں۔" اس نے بمشکل کہا۔ آواز اس کی اپنی نہیں لگ رہی تھی۔

"آپ... آپ باقی دیکھ لیں۔" اس نے نرس کو تاکید کی۔

"لیکن ڈاکٹر..."

نجف نے جواب نہیں دیا۔ وہ تیزی سے پلٹی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ پھر تیزی سے چلنے لگی۔ اتنی تیزی سے جیسے کوئی چیز اس کے پیچھے آ رہی ہو۔ راہداری کے سرے پر پہنچتے پہنچتے اس کی سانسیں بے ترتیب ہو چکی تھیں۔ دل پسلیوں سے ٹکرا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھا۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ صرف ایک خواب تھا۔
صرف ایک خواب۔ مگر آنکھوں کے سامنے وہی اندھیرا بار بار پھیل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔ وہ سامنے دیکھے بغیر چلتی رہی۔ پھر اس کا کندھا کسی سے ٹکرایا۔ وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

"سوری..."

سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اس کے الفاظ حلق میں ہی رک گئے۔ اعظم۔ ڈاکٹر اعظم۔ وہ بھی ٹھٹک گیا۔ چند لمحے تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اعظم نے نجف کے چہرے کو دیکھا۔ زرد پڑا ہوا رنگ۔ بے قرار آنکھیں۔ اور پلکوں کے کناروں پر ٹھہرے آنسو۔ وہ آج کی خبر سن چکا تھا۔ نجف کا نکاح ہو چکا تھا۔ دل میں جمع کیے گئے تمام سوال اچانک اس کے سامنے کھڑے ہوئے مگر اس کی زبان پر ان میں سے

ایک بھی سوال نہ آ سکا۔اس نے صرف آہستہ سے پوچھا۔

"تم ٹھیک ہو؟"

نجف نے نظریں چرالیں۔سر اثبات میں ہلایا۔

"نجف..." وہ ایک قدم اس کی طرف بڑھا۔" کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟"

اس کے لہجے میں شکوہ نہیں تھا۔بس ایک خواہش تھی۔جاننے کی۔وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔کیوں ہوا۔اور شاید یہ بھی کہ اس کے لیے اس تمام عرصے میں کوئی جگہ تھی بھی یا نہیں۔مگر نجف کے پاس اس وقت کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔
اس کے پاس صرف ایک خوف تھا۔اور وہ خوف اسے گھر کی طرف دھکیل رہا تھا۔

"مُجھے ابھی گھر جانا ہے۔کل بات کرتے ہیں۔"

اعظم نے اسے روکنا چاہا۔مگر نجف گزر چکی تھی۔وہ تیز قدموں سے آگے بڑھتی چلی گئی۔اعظم وہیں کھڑا اسے دور جاتا دیکھتا رہا۔اور نجف... اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔نہ راہداری۔نہ لوگ۔نہ روشنیاں۔صرف وہی اندھیرا۔وہی لمس۔اور اس کے بعد آنے والی وہ خوفناک حقیقت...جسے اس کا ذہن ابھی تک سمجھنے سے انکار کر رہا تھا۔

☆...☆...☆

کارڈیک بلاک کی خاموش،سینیٹائزڈ راہداریوں میں میڈیکل کے آخری سال کے اسٹوڈنٹس کا گروپ اپنے کلینیکل راؤنڈ کے لیے داخل ہوا تھا۔سلال پچھلے ایک ہفتے سے کالج نہیں جا رہا تھا،مگر عالیہ؟ عالیہ تو اپنے بیچ کے ساتھ یہیں تھی۔عالیہ اچھی طرح جانتی تھی کہ سلال اسی بلاک میں کہیں موجود ہوگا...لیکن جب اس کی نظریں راہداری کے موڑ پر جمیں،تو وہ ایک دم ٹھٹک کر رہ گئی۔وہاں کچھ فاصلے پر سلال ایک سینئر کارڈیالوجسٹ کے پاس کھڑا تھا۔وہ اپنے ہاتھ میں زہرہ بیگم کی میڈیکل فائل تھامے،سنجیدگی اور دھیان سے ڈاکٹر کی بات سن رہا تھا۔
عالیہ حیرانی اور بے یقینی سے اسے تکے گئی۔یہ وہ سلال نہیں تھا جسے وہ کالج کی فضاؤں میں اپنا حریف مانتی تھی...وہ سلال جو ہمیشہ ڈیسنٹ، بہترین اور باوقار حلیے میں نظر آتا تھا،آج بالکل بدل چکا تھا۔اس لڑکے کی گہری بھوری آنکھیں مسلسل شب خوابی کی شکار لگ رہی تھیں۔

چہرے کی وہ مخصوص شادابی اور روپ جیسے کسی نے چھین لیا ہو۔اس کے بال غیر معمولی حد تک روکھے اور الجھے ہوئے تھے،اور وہ ایک سادہ سی جینز اور شرٹ پر جیکٹ پہنے کھڑا تھا۔

"عالیہ...چلو!"

پاس کھڑی زنیرہ نے اس کے شانے کو چھو کر کہا،تو عالیہ جیسے کسی سحر سے چونک کر ہوش میں آئی۔

"تم چلو...میں آتی ہوں۔"عالیہ نے زبردستی خود کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے زنیرہ کو آگے بھیج دیا اور خود بے اختیار قدموں سے سلال کی جانب بڑھ گئی۔یہ قدم اس کے اپنے اختیار میں نہیں تھے۔ڈاکٹر فائل پر کچھ رقم کر کے آگے بڑھ چکا تھا،اور سلال جیسے ہی واپس پلٹا...وہ سامنے عالیہ کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔
سفید کوٹ پہنے عالیہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔وہ پہلے سے کہیں زیادہ پر رونق اور ہشاش بشاش لگ رہی تھی۔پچھلے ایک ہفتے سے سلال کالج نہیں آ رہا تھا۔اس کا سب سے بڑا حریف وہاں موجود نہیں تھا،جس پر عالیہ کو دل ہی دل میں ایک سکون اور خوشی محسوس ہونی چاہیے تھی...مگر اس وقت سلال کو اس خستہ اور بکھری ہوئی حالت میں دیکھ کر عالیہ کے دل میں ایک گہرا تاسف اور دکھ اتر آیا۔

"السلام علیکم!"عالیہ نے اپنے لرزتے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے سلام کیا۔
"وعلیکم السلام!"سلال نے نظریں جھکا کر ہلکا سا سر ہلایا۔
"اب...اب کیسی طبیعت ہے تمہاری مدرکی؟"
سلال کے لبوں پر ایک پھیکا سا تبسم ابھرا۔کیا وہ صرف اسکی ماں تھی؟ کیا وہ عالیہ کی پھوپھو نہیں تھی؟ "دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

وہ بولتے وقت عالیہ کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔وہ ہمیشہ کی طرح اپنی نظروں کا زاویہ جھکائے ہوئے تھا۔جبکہ عالیہ کی نظریں مسلسل اس کے ستے ہوئے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں۔

"سیکسوئل ہراسمینٹ کا کیس ڈال کر اسے جیل بھجوا دو!"وہ زہریلے الفاظ پنجر اسکی سماعت سے ٹکرائے۔عالیہ نے سامنے کھڑے بکھرے ہوئے لڑکے کو دیکھا۔کیا وہ سچ میں اس بے قصور،معصوم لڑکے کے ساتھ ایسا بھیانک کھیل کھیل پائے گی؟اس وقت عالیہ دو کشتیوں کی مسافر بنی ہوئی تھی۔ایک طرف نشاط کی نیت کا زہر اور دوسری طرف اپنا بیدار ہوتا ضمیر...اس کی اس اندرونی کشمکش کو کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا تھا۔

"تم...تم کالج کب آؤ گے؟"

عالیہ نے خود کو کہتے سنا۔ وہ یہ سوال پوچھنا نہیں چاہتی تھی، مگر زبان سے الفاظ بے ساختہ پھسل گئے تھے۔ سلال نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔

"امی کی حالت تھوڑی ٹھیک ہو جائے...پھر ان شاءاللہ!"

"عالیہ...!"

اس سے پہلے کہ عالیہ کچھ اور کہہ پاتی، دور سے زنیرہ کی آواز گونجی۔ سارے اسٹوڈنٹس جا چکے تھے۔ صرف وہ یہاں پیچھے رہ گئی تھی۔ سفید کوٹ میں ملبوس عالیہ نے ایک لمحے کے لیے سلال کو دیکھا۔

"خدا حافظ..."

وہ پلٹ گئی، اور سلال بھی چند لمحے وہاں خاموش کھڑے رہنے کے بعد، اپنے بوجھل قدموں کے ساتھ مخالف سمت میں بڑھ گیا۔ دونوں دو مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ دونوں کے راستے، ان کے خیالات اور ان کی دنیا الگ تھی...مگر قسمت؟ قسمت ان کے ان الگ راستوں کو کس موڑ پر جا کر ملانے والی تھی، یہ ابھی وقت کے پردے میں چھپا ہوا تھا۔

☆...☆...☆

صبح کی روشنی کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کر تھی۔ کھڑکی کا پردہ تھوڑا طرح ہٹا ہوا تھا اور شیشے سے چھن کر آنے والی دھیمی دھوپ فرش پر ایک مدھم سا مستطیل بنا رہی تھی۔ کمرے میں رات کی سیاہی باقی نہیں تھی، مگر نجف کے اندر ابھی بھی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھ کھل چکی تھی۔ کچھ لمحوں تک وہ بالکل ساکت لیٹی چھت کو دیکھتی رہی۔ سر بھاری تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے نیند نے جسم کو آرام دینے کے بجائے اسے مزید تھکا دیا ہو۔ اس نے پلکیں جھپکیں۔ کل...کل جو کچھ ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا جیسے وہ سب کسی خواب کا حصہ تھا۔ نکاح۔

سقراط۔وہ سبزہ زار۔اس کا ہاتھ۔اور پھر وہ منظر...وہ خوفناک منظر۔نجف نے فوراً آنکھیں بند کرلیں۔نہیں۔وہ خواب نہیں تھا۔اس کے جسم میں دوڑنے والی وہ سنسناہٹ ابھی بھی اسے یاد تھی۔اس نے بستر کے ساتھ رکھا فون اٹھایا۔اسکرین پر کئی نوٹیفکیشنز موجود تھے۔سب سے اوپر ثالث کا پیغام تھا۔نجف نے بے دلی سے چیٹ کھولی۔

تصویر دیکھتے ہی اس کی انگلی اسکرین پر رک گئی۔کل کے نکاح کی تصویر تھی۔درمیان میں زہرہ بیگم تکیوں کے سہارے بیٹھی تھیں۔ان کے دائیں طرف وہ تھی۔اور بائیں طرف سقراط۔دونوں سفید لباس میں تھے۔ایک ہی تصویر میں بند۔نجف کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی۔اس تصویر میں نہ کوئی محبت تھی، نہ مسکراہٹ، نہ کسی خوشگوار آغاز کی چمک۔مگر ایک حقیقت ضرور تھی۔وہ اب سقراط شبگیر کی بیوی تھی۔تصویر اس بات کا ثبوت تھی کہ کل کا دن خواب نہیں تھا۔اس نے فون کی اسکرین بند کی اور اسے واپس بستر پر رکھ دیا۔پھر اپنا سر تکیے پر گرا دیا۔اس کی آنکھیں چھت پر جمی تھیں۔اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کی زندگی اچانک کس سمت مڑ گئی تھی۔ایک طرف زہرہ آپا کی بیماری۔دوسری طرف سقراط سے نکاح۔اور اب... وہ چیز جو کسی منطق، کسی دلیل، کسی طبی تشخیص کے دائرے میں نہیں آ رہی تھی۔وہ تقریباً پندرہ منٹ اسی طرح لیٹی رہی۔خاموش اور بے حرکت۔صرف چھت کو گھورتی رہی۔پھر اچانک پیٹ میں اٹھنے والی ہلکی سی اینٹھن نے اسے یاد دلایا کہ اس نے کل سے ٹھیک طرح کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔وہ آہستہ سے اٹھ بیٹھی۔اس کا سلک کا شب خوابی کا لباس، ہر حرکت کے ساتھ اس کے جسم پر یوں پھسل رہا تھا جیسے کپڑے کو بھی اس کی بے چینی کا احساس ہو۔بال بکھرے ہوئے تھے۔چہرے پر نیند کی کوئی تازگی نہیں تھی۔وہ بستر کے کنارے بیٹھ کر چند لمحے خاموش رہی۔پھر اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر جا ٹھہریں۔دائیں ہاتھ پر۔وہی ہاتھ۔وہی انگلیاں۔جنہیں کل اس نے سقراط کی طرف بڑھایا تھا۔نجف کی نگاہیں انگلیوں پر جم گئیں۔پھر کل کا منظر اس کے ذہن کے پردے پر دوبارہ ابھرا۔سقراط کا ہاتھ آگے بڑھنا۔اس کی انگلیوں کا اس کی انگلیوں سے ملنا۔اس کی سانس ایک دم بھاری ہوگئی۔وہ دونوں ہاتھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔

کبھی انگلیاں موڑتی۔کبھی ہتھیلی کو پلٹتی۔پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔مریضوں کو چھوتے ہوئے۔نبض چیک کرتے ہوئے۔کسی کا ہاتھ تھامتے ہوئے۔کبھی نہیں۔پھر اب کیوں؟ وہ کس چیز کو چھو رہی تھی؟ یا کس چیز نے اسے چھوا تھا؟ نجف نے بے اختیار اپنے ہاتھ واپس کھینچ لیے۔وہ مزید سوچتی، اس سے پہلے ہی فون کی تیز گھنٹی نے کمرے کی خاموشی چیر دی۔وہ چونک گئی۔اسکرین پر ایک انجان نمبر تھا۔چند لمحوں تک وہ اسے دیکھتی رہی۔پھر گہری سانس لے کر کال اٹھالی۔فون کان سے لگایا۔

"ہیلو..."

چند لمحے خاموشی رہی۔پھر دوسری جانب سے وہی آواز ابھری۔وہی آواز جس کی کوئی جنس نہیں تھی ایک ایسی آواز جو سنتے ہی نجف کے جسم میں سرد لہر دوڑا دیتی تھی۔

"ہیلو، ملکانی۔"

نجف کا دل ایک لمحے کو جیسے رک گیا۔ ملکانی۔ اس ایک لفظ نے اس کے ذہن کے دروازے پر اس خواب کے تمام مناظر لا کھڑے کیے۔ وہ حویلی۔ وہ اندھیرا۔ وہ ہاتھ۔
وہ حملہ۔ اس کا گلا اور اس شخص کی گرفت۔ نجف نے آنکھیں بند کیں۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

اس کی آواز سرد تھی۔ دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر وہ گویا ہوا۔

" کیا تم جاننا نہیں چاہتیں کہ تمہارے پاس جو دل ہے...وہ کس کا ہے؟"

نجف کی انگلیاں فون کے گرد سخت ہو گئیں۔

"اور اکتیس سال پہلے کیا ہوا تھا؟"

نجف کے چہرے سے جیسے سارا خون اتر گیا۔ اکتیس سال۔ وہی عدد۔ وہی نامعلوم ماضی جس کی طرف جانے والی ہر راہ کسی نہ کسی طرح اسی شخص تک پہنچتی تھی۔ چند لمحے تک وہ کچھ نہ بولی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

"ہاں۔ جاننا چاہتی ہوں۔"

دوسری جانب خاموشی ٹوٹی۔

"چلو پھر... پتہ دے رہا ہوں۔ وہاں پہنچ جاؤ۔"

وہ پتہ بتانے ہی والا تھا کہ نجف نے اسکی بات کاٹ دی۔

"میں جانتی ہوں تم مُجھے کہاں بلانے والے ہو۔"

اس کی آواز میں ایسا یقین آ گیا کہ دوسری جانب موجود شخص بھی خاموش ہو گیا۔نجف نے آنکھیں بند کیں۔اس کے ذہن میں ایک عمارت ابھری۔

"اچھا کہاں؟"

نجف نے آہستہ آہستہ وہی پتہ بتا دیا۔دوسری جانب بھیانک خاموشی چھا گئی۔نجف کے دل کی دھڑکنیں اس خاموشی میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جب میں وہاں پہنچوں گی تو کیا ہوگا۔تم مجھ پر حملہ کرو گے۔مُجھے فرش پر پٹخو گے۔پھر میرا گلا دباؤ گے۔"ایک لمحے کو اس کی اپنی آواز اسے اجنبی لگی۔مگر وہ رکی نہیں۔"میں جانتی ہوں تم مُجھے مارنا چاہتے ہو۔"

خاموشی۔ایسی بھیانک خاموشی جس میں دوسری طرف سانس تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔نجف کی پیشانی پر پسینے کی ایک باریک تہہ ابھر آئی۔اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ یہ سب کیسے جانتی تھی۔یہ الفاظ اس کے ذہن سے نہیں نکل رہے تھے۔جیسے وہ انہیں یاد نہیں کر رہی تھی... جیسے وہ انہیں دوبارہ دیکھ رہی تھی۔اس نے فون کو کان سے اور قریب کیا۔

"مجھ سے بات کرنی ہے تو...مکھٹ اتار کر آؤ..."اس کی آواز مزید سخت ہو گئی۔"ورنہ..."

ٹوں۔ٹوں۔ٹوں۔کال ختم ہو چکی تھی۔نجف فون کان سے لگائے کچھ لمحے یونہی بیٹھی رہی۔پھر آہستہ سے اسے اپنے سامنے کیا۔وہ اسکرین کو دیکھتی رہی۔اس کے چہرے پر بے یقینی پھیل گئی۔تو کیا...وہ خواب نہیں تھا؟ وہ سب واقعی ہونے والا تھا؟ وہ شخص واقعی اسے اسی جگہ بلانے والا تھا؟ واقعی اس پر حملہ کرنے والا تھا؟ واقعی اس کا گلا دبانے والا تھا؟ مگر کیوں؟ وہ اسے مارنا کیوں چاہتا تھا؟ اور اس سے بھی بڑا سوال...اگر یہ سب اسے پہلے سے معلوم ہو چکا تھا...تو وہ یہ سب جانتی کیسے تھی؟

☆...☆...☆

سرمد صاحب فیکٹری میں اپنے آفس کی چمڑے کی بڑی کرسی پر بوجھل وجود کے ساتھ ڈھائے ہوئے بیٹھے تھے۔ سامنے میز پر بکھری فائلیں ان کی توجہ کی منتظر تھیں، مگر ان کا ذہن کہیں دور الجھا ہوا تھا۔ نیمل کی شادی کے دن جو کچھ ہوا تھا اور پھر زہرہ بیگم کا آئی سی یو تک پہنچنا...اس سب نے سرمد صاحب کو اندر سے یکسر توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک باوقار اور خوددار باپ تھے، مگر اس ایک حادثے نے جیسے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ سب سے زیادہ کربناک بات یہ تھی کہ یہ دھوکہ کسی اجنبی سے نہیں، بلکہ ان کے سب سے پرانے اور قابلِ اعتماد دوست سلطان احمد کی طرف سے ملا تھا۔

دونوں کالج کے دنوں سے کلاس فیلو تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں خواب تھے۔ بڑے خواب! مگر دونوں کی سمتیں الگ تھیں۔ سلطان احمد کو ہمیشہ سے ایک بااثر بیوروکریٹ بننا تھا اور وہ بن گیا...جبکہ سرمد صاحب نے محنت کر کے کاروبار کی دنیا میں اپنا نام بنایا۔ اتنے سال گزر گئے، دونوں کی دوستی قائم رہی، وہ اکثر ملتے تھے، دکھ سکھ بانٹتے تھے۔ مگر رخصتی کے دن سلطان احمد اور اس کے بیٹے شاہ زیب نے جو تماشا بنایا تھا، اس کے بعد سرمد صاحب کی روح تک زخمی ہو چکی تھی۔

"اک دوست نے ایسا کیوں کیا تھا؟" وہ یہی سوال بار بار اپنے آپ سے پوچھ رہے تھے۔ مگر وہ یہ بات بھول چکے تھے کہ خاندان، دوسری سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ سوچ کے انہی تاریک اور تلخ دھاگوں میں الجھے سرمد صاحب کی نظر اچانک میز پر رکھے بجتے ہوئے موبائل فون پر پڑی۔ اسکرین پر 'سلطان احمد' لکھا چمک رہا تھا۔ سرمد صاحب کا دل ایک لمحے کو تھم گیا۔ ان کی آنکھوں میں ضبط کی نمی تیر گئی۔ انہوں نے اپنے جذبات اور ابال پر سخت مشکل سے قابو پایا اور فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

" کیسے ہو سرمد؟"

ان کے روایتی ہیلو کہنے سے پہلے ہی دوسری طرف سے سلطان احمد کی بالکل نارمل، بے حس آواز ابھری۔ سرمد صاحب نے ایک طویل، گہری اور بوجھل سانس لی۔

"تم نے ایسا کیوں کیا سلطان؟ کیوں...؟" ان کا لہجہ دکھ، ٹوٹے ہوئے مان اور کسمپرسی سے بھرا ہوا تھا۔ مگر دوسری جانب سے سلطان احمد کی آواز میں نہ تو کوئی ندامت تھی اور نہ ہی پشیمانی۔

"جو بھی ہوا اسے بھول جاؤ...اور میری بات دھیان سے سنو، میں چاہتا ہوں تم نیمل کو گھر چھوڑ جاؤ۔"

ان اگلے ہی جملے نے سرمد صاحب کو اپنی جگہ بالکل ساکت و جامد کر دیا۔ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور مٹھیاں خود بخود اتنی سختی سے بھینچ گئیں کہ ناخن ہتھیلیوں میں چبھنے لگے۔

"دیکھو سرمد! جو کچھ بھی ہوا...رخصتی نہیں ہو سکی۔شاہ زیب غصے میں تھا، دونوں بچوں کے درمیان کچھ کہہ سن ہو گئی...لیکن اب تم نیمل کو یہاں اس کے سسرال چھوڑ جاؤ۔اس کا گھر یہی ہے۔"

سرمد صاحب کے اندر جیسے کوئی لاوا پھٹ پڑا۔ان کا تنفس تیز ہو گیا۔

"میں تم جیسے درندوں کے گھر اپنی بیٹی بھیجوں گا؟ تم نے سوچا بھی کیسے سلطان؟"
دوسری جانب چند لمحات کے لیے ایک گہرا اور بوجھل سکوت چھا گیا۔پھر سلطان احمد کی ٹھنڈی، مکارانہ آواز گونجی۔

"عقل سے کام لو سرمد! ساری عمر اسے گھر بٹھا کر رکھو گے؟ تمہاری دوسری بیٹیاں بھی ہیں...ذرا ان کا سوچو! بڑی بیٹی کو طلاق ہو گئی تو ان کے مستقبل کا کیا ہو گا؟ کون کرے گا ان سے شادی؟"

یہ بات سنتے ہی سرمد صاحب کا چہرہ غصے اور غیرت سے بالکل سرخ پڑ گیا۔ان کی کنپٹی کی رگیں پھول گئیں۔

"تم اس قابل نہیں ہو سلطان کہ تم پر لعنت بھی بھیجی جائے...اور تم کہہ رہے ہو، میں اپنی بیٹی بھیج دوں؟ سچ کہا تھا کسی نے کتا تخت پر بیٹھ جائے تو بھی کتا ہی رہتا ہے۔"

"تم پچھتاؤ گے سرمد! بہت پچھتاؤ گے..."

اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے فون منقطع ہو گیا۔کمرے میں دوبارہ ایک ہولناک اور دم گھوٹتا ہوا سناٹا چھا گیا۔سرمد صاحب نے

فون میز پر رکھا، تو ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور ہاتھ ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے۔ دنیا میں دشمن کا وار انسان جھیل جاتا ہے، مگر جب دوست کی طرف سے دھوکہ ملتا ہے تو وہ صرف اعتبار نہیں توڑتا، بلکہ انسان کا اپنے آپ سے بھی بھروسہ اٹھا دیتا ہے۔ سرمد صاحب جان چکے تھے کہ جس شخص کو وہ دہائیوں سے اپنا بھائی سمجھتے رہے، وہ دراصل ان کی خوشیوں کو دیمک کی طرح چاٹنے والا سب سے بڑا آستین کا سانپ تھا۔ اور سانپ کا سر کچلنے کا وقت آ چکا تھا۔ انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے فون اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔ بیک جا رہی تھی اور پھر فون اٹھا لیا گیا۔

"جی تایا جان؟" دوسری جانب سے آواز ابھری اور پھر سرمد صاحب سرخ چہرہ لیے کچھ کہہ رہے تھے۔

☆...☆...☆

ہسپتال کی رات اپنی رفتار سے گزر رہی تھی۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی۔ کھڑکی کے باہر شہر جاگ رہا تھا، مگر نیمل کے اندر جیسے ہر چیز سو گئی تھی۔ وہ صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ فون اس کی ہتھیلی میں تھا۔ واٹس ایپ کھولا تو اسکرین پیغامات سے بھری پڑی تھی۔ کچھ نام ایسے تھے جنہیں دیکھ کر عام دنوں میں وہ فوراً جواب دیتی۔ کچھ وہ لوگ تھے جو شادی کی مبارک باد دینے والے تھے، کچھ وہ جنہوں نے شاید رخصتی نہ ہونے کی خبر سن کر خیریت دریافت کی تھی، کچھ ایسے بھی تھے جو صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر ہوا کیا تھا۔

Are you okay?

"نیمل، پلیز جواب دو۔"

"ہمیں بہت افسوس ہے۔"

"کیا ہوا تھا؟"

"کیا شاہ زیب نے..."

اس نے انگلی اسکرین پر رکھی۔ پھر سب کچھ بند کر دیا۔ وہ کسی کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ شاید اس لیے نہیں کہ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اگر اس نے کسی کو جواب دے دیا تو اسے خود بھی ماننا پڑتا کہ واقعی اس کے ساتھ یہ سب ہو چکا تھا۔ اس نے فون دوبارہ کھولا۔ اس بار سوشل میڈیا کی ایک نیوز ویڈیو سامنے آ گئی۔ سرخی بڑی تھی۔

"زوریز ریپ کیس: ملزم کو ضمانت نہ مل سکی۔"

نیمل کی انگلی رک گئی۔ اس نے ویڈیو چلا دی۔ اسکرین پر عدالت کے باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ مائیک ہاتھوں میں لیے صحافی کھڑے تھے۔ کیمرے مسلسل چل رہے تھے۔ پولیس اہلکار لوگوں کو پیچھے ہٹا رہے تھے۔ کچھ عورتیں رو رہی تھیں، کچھ نعرے لگا رہی تھیں۔ پھر ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

"ہمیں انصاف چاہیے!"

نیمل نے فون ذرا قریب کر لیا۔ وہ لڑکی کا خاندان تھا۔ وہی بے بسی۔ وہی چیخیں۔ وہی مطالبہ۔ انصاف۔ نیمل کے لب ہلکے سے کھلے مگر آواز نہ نکلی۔ یہ اس شہر کا روز کا کام تھا۔ خبر پڑھنے والے اینکر نے بتایا کہ زوریز کی ضمانت مسترد ہو چکی تھی، تاہم کیس میں شامل باقی ملزمان کی تلاش جاری تھی۔ متاثرہ لڑکی کے اہل خانہ کئی دنوں سے احتجاج کر رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا جیسے وہ اس اسکرین پر موجود ہجوم میں خود بھی کھڑی ہے۔ ایک اور خاندان۔ ایک اور لڑکی۔ ایک اور کیس۔ ایک اور امید کہ شاید اس بار کچھ مختلف ہوگا۔ پھر نیوز فوٹیج بدل گئی۔ سڑک پر احتجاج تھا۔ پلے کارڈز اٹھے ہوئے تھے۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ کسی ماں کی آواز ریکارڈنگ میں بار بار آ رہی تھی۔

"ہمیں ہماری بیٹی کے لیے انصاف چاہیے۔"

نیمل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ کاش انصاف اتنی آسانی سے مل جاتا جتنا ظلم کیا جاتا ہے۔ مگر خبر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اینکر نے اگلی تفصیل بتائی۔

"باقی ملزمان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں۔"

پھر اسکرین پر چند تصویریں نمودار ہوئیں۔نام۔چہرے۔پس منظر۔اور پھر...شاہ زیب۔نیمل کا سانس ایک لمحے کو رک گیا۔اس کا چہرہ اسکرین پر تھا۔وہی آنکھیں۔وہی سخت جبڑا۔وہی شخص جس کے بارے میں اب وہ جان چکی تھی کہ اپنے بھائی کو بچانے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔خبر میں اس کا نام ملزمان کے خاندان کے حوالے سے لیا جا رہا تھا۔نیمل نے فوراً فون کی اسکرین بند کر دی۔کمرے میں اندھیرا سا پھیل گیا۔اس نے فون اپنی گود میں رکھ دیا۔کچھ لمحے تک وہ بالکل ساکت بیٹھی رہی۔پھر اس کی انگلیاں بے اختیار فون کے کنارے کو مضبوطی سے پکڑ گئیں۔

وہ جانتی تھی۔یہ صرف ایک کیس نہیں تھا۔یہ صرف زور یز نہیں تھا۔یہ صرف اس لڑکی کا خاندان نہیں تھا۔یہ ایک ایسا نظام تھا جہاں طاقتور آدمی کے پاس وکیل ہوتے ہیں،تعلقات ہوتے ہیں،پیسے ہوتے ہیں،وقت ہوتا ہے... اور متاثرہ لڑکی کے پاس صرف ایک سچ۔اور اکثر اوقات سچ اکیلا رہ جاتا ہے۔نیمل نے آنکھیں بند کر لیں۔اسے اپنی شادی یاد آئی۔اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔وہ اپنے بارے میں نہیں سوچنا چاہتی تھی۔مگر ذہن کہاں مانتا تھا؟اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔اس نے دھیرے سے سر پیچھے گرا دیا۔

"کاش..."

لفظ اس کے لبوں پر آ کر ٹوٹ گیا۔ کاش انصاف خبر کی سرخی نہ ہوتا۔کاش اسے حاصل کرنے کے لیے کسی خاندان کو سڑک پر نہ آنا پڑتا۔ کاش کسی لڑکی کو اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا ثبوت دینے کے لیے پوری دنیا کے سامنے خود کو دوبارہ قتل نہ کرنا پڑتا۔اور سب سے بڑھ کر... کاش طاقتور لوگوں کے نام قانون کے سامنے اتنے ہی معمولی ہوتے جتنے عام لوگوں کے۔نیمل نے دوبارہ فون اٹھایا۔اسکرین ابھی بھی بند تھی۔اس نے اسے دیکھا۔پھر بہت آہستہ سے فون الٹا کر کے میز پر رکھ دیا۔

وہ جانتی تھی کہ یہ خبر کل کسی دوسری خبر سے بدل جائے گی۔احتجاج ختم ہو جائے گا۔لوگ تھک جائیں گے۔کیمرے کسی اور طرف مڑ جائیں گے۔اور شاید کچھ عرصے بعد... یہ ریپ کیس بھی صرف ایک پرانی خبر بن کر رہ جائے گا۔مگر جس لڑکی کے ساتھ وہ ہوا تھا،اس کے لیے؟وہ خبر کبھی پرانی نہیں ہوگی۔نیمل نے اپنے گھٹنوں کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔اور پہلی بار اسے اپنے مستقبل سے زیادہ اس سوال نے خوفزدہ کیا... اگر انصاف نہ ملا تو پھر اس سب کا انجام کیا ہوگا؟شاید کچھ بھی نہیں۔پاکستان میں کسی کو انصاف کب ملا ہے؟

☆...☆...☆

شام ڈھلنے لگی تھی جب نجف دوبارہ ہسپتال پہنچی۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد ہسپتال کا ماحول بظاہر ویسا ہی تھا۔ وہی روشن کوریڈور، وہی جراثیم کش ادویات کی مخصوص بو، وہی تیزی سے گزرتے ڈاکٹر، وہی نرسوں کے قدموں کی آوازیں۔ مگر نجف کے لیے کچھ بھی ویسا نہیں تھا۔ وہ میڈیکل بلاک سے گزر رہی تھی کہ ایک نرس تیزی سے اس کی طرف آئی۔

"ڈاکٹر نجف..."

نجف رک گئی۔ نرس کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی تھی۔

"وہ مریضہ... جسے آپ نے کل دیکھا تھا..."

نجف کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ "کیا ہوا؟"

"وہ... نہیں رہیں۔" نرس نے نظریں جھکا لیں۔ چند لمحوں کے لیے نجف کو لگا جیسے اس نے کچھ غلط سنا ہے۔ "آج دوپہر اچانک ان کی حالت بگڑی تھی۔ ہم نے بہت کوشش کی، لیکن..."

باقی الفاظ نجف تک پہنچے ہی نہیں۔ "وہ... نہیں رہیں۔" یہ تین لفظ اس کے ذہن میں کسی گونج کی طرح پھیل گئے۔ اس نے بے اختیار اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ وہی ہاتھ۔ وہی دایاں ہاتھ جس سے اس نے کل اس مریضہ کی کلائی تھامی تھی۔ اور پھر اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا جس میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، مگر پھر بھی اس میں کسی خوفناک حقیقت کی موجودگی محسوس ہوتی تھی۔ نجف کی سانس سینے میں اٹک گئی۔
کل اس نے سوچا تھا شاید یہ صرف ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ ایک وہم۔ اس کے ذہن کا فریب۔ مگر آج وہ عورت مر چکی تھی۔ اور وہ اندھیرا... وہ حقیقی تھا۔ نجف کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے دوبارہ اپنی ہتھیلی دیکھی جیسے وہاں کسی راز کا نشان تلاش کر رہی ہو۔

"ڈاکٹر؟"

نرس کی آواز نے اسے چونکایا۔ نجف نے اس کی طرف دیکھا، مگر جیسے اسے پہچاننے میں بھی چند لمحے لگ گئے۔ وہ اچانک پلٹی اور وارڈ سے باہر نکل آئی۔ قدم تیز ہوتے گئے۔ پھر اور تیز۔ کوریڈور کی روشنیاں اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلا رہی تھیں۔

اسے سانس نہیں آ رہا تھا۔اس نے کوٹ کے کالر کے قریب ہاتھ لے جا کر جیسے اسے ڈھیلا کرنا چاہا۔ایک گہری سانس لینے کی کوشش کی۔ہوا اندر گئی ہی نہیں۔

اس نے منہ کھول کر دوبارہ سانس لینے کی کوشش کی۔سینے میں گھٹن بڑھتی گئی۔وہ دیوار کے قریب جا کر رک گئی۔ایک ہاتھ دیوار پر رکھا۔ دوسرا اپنے سینے پر۔اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے،مگر وہ انہیں پلکوں کے پیچھے روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔وہ ڈاکٹر تھی۔اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے کتنے مریضوں کو مرتے دیکھا تھا۔کتنی بار مانیٹر کی مسلسل سیدھی لکیر دیکھی تھی۔کتنی بار موت کا وقت لکھا تھا۔کتنی بار کسی خاندان کو یہ خبر دی تھی کہ اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔لوگ کہتے تھے ڈاکٹر موت کے عادی ہو جاتے ہیں۔شاید ہو بھی جاتے ہوں۔مگر یہ موت؟ یہ وہ موت تھی جس سے پہلے اس نے اندھیرا دیکھا تھا۔ایک ایسا اندھیرا جس کا وجود کل تک صرف اس کے خواب میں تھا۔آج وہ ایک لاش کے ساتھ کھڑا تھا۔نجف نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔تب ہی کوئی خاموشی سے اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"ڈاکٹر...."

مضبوط آواز نے اسے ان اندھیروں سے باہر کھینچ لیا۔نجف نے چونک کر رخ موڑا۔
سقراط اس کے قریب کھڑا تھا۔اس کی آنکھوں میں معمول کی سختی تھی،مگر نجف کی حالت دیکھ کر ان میں ایک لمحے کو تشویش ابھری تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟"

نجف نے فوراً چہرہ دوسری طرف کر لیا۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کی آنکھوں میں تیرتا خوف دیکھے۔سقراط نے کچھ دوبارہ پوچھا بھی نہیں۔ شاید وہ جانتا تھا کہ بعض اوقات سوال انسان کو جواب دینے پر مجبور کر دیتے ہیں،جبکہ خاموشی اسے سانس لینے کی مہلت دے دیتی ہے۔چند لمحے بعد اس نے کہا۔

"بھابھی تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

نجف نے اس کی طرف دیکھا۔"آپا؟"

"ہاں۔"سقراط نے مختصر جواب دیا۔

"ان کی سرجری کل صبح چھ بجے ہے۔تیاری چل رہی ہے۔انہوں نے تمہیں بلایا ہے۔"

صرف چند گھنٹے باقی تھے۔اس نے پلکیں جھپکائیں اور اپنے چہرے پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"میں...آتی ہوں۔"

سقراط ایک طرف ہو گیا۔نجف تیز قدموں سے وہاں سے نکل گئی۔اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے دروازہ بند کیا۔پھر واش روم میں جا کر چہرے پر ٹھنڈا پانی پھینکا۔ایک بار۔پھر دوسری بار۔پھر تیسری بار۔وہ کافی دیر تک سنک کے سامنے کھڑی رہی۔پانی کے قطرے اس کے چہرے سے ٹپک رہے تھے۔اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔آئینے میں ایک ڈاکٹر کھڑی تھی۔سفید کوٹ۔تھکی ہوئی آنکھیں۔پھیکی رنگت اور خوف۔بہت گہرا خوف۔نجف نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے۔کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔پھر ایک ہاتھ پلٹا۔دوسرا دیکھا۔کچھ بھی نہیں تھا۔کوئی نشان نہیں۔کوئی زخم نہیں۔کوئی ایسی چیز نہیں جسے چھو کر وہ ثابت کر سکتی کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ حقیقت تھا۔مگر حقیقت تو ابھی اس کے سامنے تھی۔وہ مریضہ مر چکی تھی۔اس نے آئینے سے نظریں ہٹا لیں۔کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں بند کیں، گہری سانس لی اور خود کو زبردستی پرسکون کیا۔وہ ڈاکٹر تھی۔اسے خود کو سنبھالنا تھا۔وہ چند منٹ بعد کمرے سے باہر نکلی تو اس کے چہرے پر پہلے جیسی گھبراہٹ نہیں تھی۔کوریڈور میں سقراط اب بھی موجود تھا۔وہ دیوار سے ذرا فاصلے پر کھڑا تھا۔نجف رک گئی۔

"تم گئے نہیں؟"

"تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

بس اتنے سے الفاظ تھے۔سادہ اور عام سے مگر نجف جانے کیوں ٹھٹک گئی۔اس نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔سقراط نے سیاہ ٹراؤزر کے ساتھ سادہ شرٹ پہن رکھی تھی۔وہ کالج سے سیدھا ہسپتال آیا تھا۔اسکی یہی روٹین تھی۔وہ کالج جاتا تھا اور پھر ہسپتال آ جاتا۔نجف کچھ کہنا چاہتی تھی۔شاید یہ کہ اسے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔شاید یہ کہ وہ خود جا سکتی ہے۔مگر الفاظ لبوں تک آ کر رک گئے۔اس نے صرف نظریں جھکا لیں۔دونوں ساتھ چل پڑے۔نجف ایک قدم آگے تھی۔اس کا سفید کوٹ ہلکی ہوا کے ساتھ پیچھے کو لہرا رہا تھا، گلے میں لٹکا سٹیتھوسکوپ اس کے قدموں کے ساتھ ہل رہا تھا۔اور اس کے پیچھے سقراط تھا۔اسکے گلے میں کوچ کی سیٹی لٹکی تھی۔ایک طرف ڈاکٹر۔

دوسری طرف کوچ۔ایک کو اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے والے اندھیرے کا خوف تھا۔اور دوسرے کو شاید ابھی معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ چلنے والی عورت کی زندگی میں ایک ایسا راز جاگ چکا ہے جو اسے نگل رہا تھا۔

☆...☆...☆

رات اور صبح کے درمیان کا وہ وقت تھا جب شہر ابھی پوری طرح جاگا نہیں تھا۔گھڑی کی سوئیاں تقریباً چار بجا رہی تھیں۔بزدار پیلس کے ایک کمرے میں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔پردوں کے پیچھے رات کی آخری سیاہی ٹھہری ہوئی تھی اور باہر کہیں دور کسی پرندے کی مدھم آواز سنائی دے دیتی تھی۔حق آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔اس نے شرٹ کے آخری بٹن کو درست کیا، کف لنکس بند کیے اور پھر کلائی پر گھڑی باندھنے لگا۔عام طور پر اس کے اٹھنے، تیار ہونے، چیزیں رکھنے یا اٹھانے کی کوئی آواز نہیں ہوتی تھی۔وہ برسوں سے اس طرح جیتا آیا تھا جیسے خاموشی بھی اس کی عادت ہو۔مگر آج...دروازہ کھلنے کی آواز۔الماری کا پٹ بند ہونے کی آواز۔میز پر رکھی چابی اٹھاتے ہوئے ہلکی سی کھنک۔پھر ایک لمحے بعد دراز بند ہوئی۔یہ معمولی سی آوازیں بستر پر سوئی سلویٰ کے لیے کافی تھیں۔اس کی آنکھ کھل گئی۔وہ چند لمحے بے خبر سی چھت کو دیکھتی رہی، پھر نظریں گھما کر حق کو دیکھا۔وہ آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔سلویٰ نے تکیے سے سر ذرا سا اٹھایا اور ناگواری سے اسے دیکھا۔ حق نے آئینے میں اس کا عکس دیکھا، مگر فوراً رخ پھیر لیا۔

"ہسپتال جا رہا ہوں۔"زہرہ بیگم کی سرجری کرنے والا وہی تھا۔سلویٰ نے یہ سوال نہیں کیا تھا مگر وہ اطلاع دے رہا تھا۔سلویٰ کی بھنویں سکڑ گئیں۔

"تو میں کیا کروں؟مُجھے سکون سے سونے کیوں نہیں دے رہے ہو؟"وہ نخوت سے بولی۔حق نے گھڑی کی طرف دیکھا۔اس نے میز سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔سلویٰ اب پوری طرح جاگ چکی تھی۔اسکا موڈ خراب ہو چکا تھا۔حق نے پلٹ کر اسے دیکھا۔اس کے چہرے پر حسبِ معمول کوئی تاثر نہیں تھا، مگر آنکھوں میں وہ بے چینی تھی جو سلویٰ سے چھپی نہیں۔وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔پھر آہستہ سے بولا۔

"مُجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔"

سلویٰ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔"کیا؟"

حق نے ایک لمحہ ٹھہر کر اسے دیکھا۔ وہ کوئی عام سا انسان ہوتا تو اسے سلوی سے شدید محبت ہوتی۔ لیکن اسکی زندگی کے حادثات نے اسے محبت کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اسے بتا نہیں سکتا تھا۔ کل رات آنے والی وہ کال ابھی تک اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

"آپ کی بیوی کی جان کو خطرہ ہے۔"

اسے معلوم نہیں تھا خطرہ کہاں سے تھا۔ کس طرف سے تھا۔ کون تھا۔ مگر اتنا جانتا تھا کہ وہ اسے معمول کے مطابق گھر سے باہر نہیں جانے دے سکتا۔ اس نے بالآخر خود کو کہتے سنا۔

"تم کچھ دنوں تک گھر سے باہر مت نکلنا۔"

سلویٰ نے اسے ایسے دیکھا جیسے اسے یقین ہی نہ آیا ہو "کیا؟"

"تم نے سنا ہے سلویٰ..." حق کا لہجہ سرد ہوا۔

"ہاں، میں نے سنا ہے۔ اسی لیے پوچھ رہی ہوں، کیا بکواس ہے یہ؟"

حق خاموش رہا۔ سلویٰ کے لہجے میں حیرت کی جگہ اب ناگواری آ رہی تھی۔

"تم کہیں جا بھی نہیں سکتیں... فی الحال نہیں۔"

"اور یہ فیصلہ تم نے کیا ہے؟" سلوی کے چہرے پر تمسخر ابھرا۔

"ہاں۔"

"کس حیثیت سے؟"

"تمہارا شوہر ہوں۔"

سلویٰ کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ آئی۔ "شوہر؟"

اس ایک لفظ میں کئی برسوں کی تلخی تھی۔

"کمال ہے۔ جب مُجھے تمہاری ضرورت تھی تب تمہیں یاد نہیں تھا کہ تمہاری کوئی بیوی بھی ہے اور اب اچانک تمہیں میری نقل و حرکت کی فکر ہونے لگی؟"

"بات وہ نہیں ہے۔" حق کے تاثرات سپاٹ ہوئے۔

"تو کیا بات ہے؟" وہ بستر سے اتر آئی۔

"مُجھے کہیں جانے سے کیوں روک رہے ہو؟"

"بس کچھ دن۔"

"کتنے دن؟" وہ بے خوف سی اسکے سامنے کھڑی تھی۔ سینے پر بازو باندھے ہوئے۔

"پتا نہیں۔"

حق نے گہری سانس لی۔ اسے معلوم تھا وہ سوال کرے گی۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسے حقیقت نہیں بتا سکتا۔ اگر اسے فون والی بات بتاتا تو وہ خوفزدہ ہوتی۔ اگر خطرے کا ذکر کرتا تو شاید وہ گھر سے نکلنے کے بجائے کسی اور طرح خود کو خطرے میں ڈال دیتی۔ وہ خاموش رہا۔ سلویٰ نے اس خاموشی کو اپنے انداز میں سمجھ لیا۔

"میں تمہاری قیدی نہیں ہوں، حق۔"

"میں نے یہ نہیں کہا۔"

"تمہارا انداز یہی کہہ رہا ہے۔"

حق نے ہونٹ بھینچ لیے۔ کمرے میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"صرف کچھ دن میری بات مان لو۔"

سلویٰ نے اسے دیکھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس کے لہجے میں حکم نہیں تھا۔ درخواست تھی۔ مگر اس درخواست کے پیچھے چھپی وجہ وہ نہیں جانتی تھی۔

"اور اگر میں نہ مانوں؟" حق کی نظریں اس کی آنکھوں سے ہٹ گئیں۔

"تو میں تمہیں روکوں گا۔"

"زبردستی؟" سلویٰ کے چہرے پر حیرت ابھری۔ حق نے فوراً جواب نہیں دیا۔ چند لمحے گزر گئے۔ سلویٰ کی نظریں اسکے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ شاندار لگتا تھا۔

"ضرورت پڑی تو۔"

وہ اس کے قریب سے گزرا۔ دروازے تک پہنچا۔ سلویٰ ابھی بھی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں لگتا ہے تم مُجھے روک پاؤ گے؟"

وہ رک گیا۔حق کی پشت اس کی جانب تھی۔اس کی انگلیاں دروازے کے ہینڈل پر جم گئیں۔وہ ایک لمحے کو پلٹا۔اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی کہ سلویٰ کی اگلی بات لبوں پر ہی رک گئی۔

"مُجھے افسوس رہے گا کہ میں نے تم جیسی کم عقل عورت سے شادی کی۔"

پھر دروازہ کھولا۔اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔سلوی جیسے اپنی جگہ جم گئی۔چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا۔غصے کا ایسا طوفان اٹھا کہ دل چاہا سب تہس نہس کر دے مگر اسے اپنی پوزیشن خراب نہیں کرنی تھی۔وہ مٹھیاں بھینچ کر ضبط کر گئی۔بس کچھ دن اور...پھر وہ آزاد ہو جاتی۔

☆...☆...☆

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ہسپتال کے کارڈیک بلاک کی راہداری معمول سے کہیں زیادہ خاموش تھی۔زہرہ بیگم کو آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا۔وہ اسٹریچر پر نیم دراز تھیں۔چہرہ قدرے زرد تھا،مگر آنکھوں میں مانوس شفقت موجود تھی۔یوں لگتا تھا جیسے وہ خود اس لمحے سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اپنے اردگرد کھڑے بچوں کو حوصلہ دے رہی ہوں۔پچھلی رات،تارہ،نوفہ،نامرہ اور دادی سب ان سے مل کر گئے تھے۔سقراط اسٹریچر کے ایک طرف خاموش چل رہا تھا۔نجف دوسری جانب تھی۔نیمل،سلال اور سرمد صاحب ان کے پیچھے تھے۔زہرہ بیگم نے ایک ایک کو دیکھا تھا۔نجف کو بار بار تاکید کی تھی کہ وہ خود کو سنبھالے رکھے۔سلال کو پڑھائی کے بارے میں سمجھایا تھا۔سقراط کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے کہا تھا کہ وہ اس کے بچوں کا خیال رکھے۔اور نیمل کو دیکھ کر بس اتنا کہا تھا۔

"اپنے بہن بھائیوں کو کبھی ایک دوسرے سے دور مت ہونے دینا۔"

نیمل نے کچھ نہیں کہا۔صرف ان کا ہاتھ تھام کر ہلکا سا دبا دیا تھا۔اب وہ آپریشن تھیٹر کے قریب پہنچ رہے تھے۔نجف کی نگاہیں مسلسل زہرہ بیگم کے چہرے پر تھیں۔
وہ جانتی تھی یہ آپریشن کتنا اہم تھا۔یہ صرف ایک سرجری نہیں تھی۔یہ زہرہ بیگم کی زندگی اور موت کے درمیان کھڑی آخری امید تھی۔اسٹریچر کچھ لمحوں کے لیے رکا۔

زہرہ بیگم نے نجف کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نجف..."

"جی، آپا؟" نجف فوراً جھکی۔

زہرہ بیگم نے اس کی انگلیاں اپنے کمزور ہاتھ میں لے لیں۔ نجف کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی سی مسکراہٹ آئی۔

"مُجھے کچھ ہو گیا تو سب کو سنبھال لینا۔"

"آپ بالکل ٹھیک ہو کر واپس آئیں گی۔ میں خود آپ کو باہر لے کر آؤں گی۔"

زہرہ بیگم مسکرائیں۔ "مُجھے اپنے لیے فکر نہیں ہے۔"

نجف کی مسکراہٹ تھم گئی۔ "تو پھر؟"

زہرہ بیگم نے اس کی انگلیاں تھوڑی مضبوطی سے تھام لیں۔ "تمہارے لیے ہے۔"

نجف نے بھنویں سکیڑیں۔ "میرے لیے کیوں؟"

"دل کی بیماری انسان کو کھا جاتی ہے۔" جانے انہوں نے کس مفہوم میں کہا تھا مگر نجف کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کی انگلیوں میں اچانک لرزش دوڑ گئی۔ پہلے صرف انگلیاں کانپیں۔ پھر کلائی۔ پھر پورا وجود۔ اس کی نظریں زہرہ بیگم کے ہاتھ سے ہٹ کر سامنے کہیں جا ٹھہریں۔ اور اگلے ہی لمحے... سب کچھ غائب ہو گیا۔ راہداری نہیں تھی۔ لوگ نہیں تھے۔ سفید دیواریں نہیں تھیں۔ زہرہ بیگم کی آواز نہیں تھی۔ صرف... اندھیرا تھا۔ گہرا اور بے انتہا۔ ایسا اندھیرا جس میں آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نجف نے سانس لینے کی کوشش کی۔ ایک لمبی سانس۔ مگر ہوا جیسے سینے تک پہنچنے سے پہلے ہی کہیں ختم ہو گئی۔ اس کا سینہ جکڑ گیا۔ دل بے ترتیب

دھڑکنے لگا۔اس نے زہرہ بیگم کی انگلیاں چھوڑنے کی کوشش کی مگر اس کی اپنی انگلیاں جیسے سن ہو چکی تھیں۔پھر اندھیرے میں وہی منظر ابھرا۔

ایک کلائی۔ایک ہاتھ۔اس کے اپنے ہاتھ میں۔اور پھر وہی تاریکی۔نجف کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

"نہیں...یہ نہیں ہوسکتا تھا۔"

یہ صرف خواب تھا۔صرف خواب...صرف وہم۔مگر وہ اندھیرا اتنا حقیقی تھا کہ اس کے وجود کا ہر ذرہ اسے پہچان رہا تھا۔

"نجف..."

کسی کی آواز بہت دور سے آئی۔شاید سقراط کی۔شاید نیمل کی۔وہ جواب نہیں دے سکی۔اس نے منہ کھولا مگر آواز نہیں نکلی۔اور پھر اچانک اسٹریچر حرکت میں آ گیا۔

زہرہ بیگم کو اندر لے جانے کا وقت ہو چکا تھا۔نجف کی انگلیاں ان کے ہاتھ سے الگ ہو گئیں۔اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔زہرہ بیگم کچھ کہہ رہی تھیں۔

شاید نیمل کا نام۔شاید کوئی دعا۔مگر نجف کچھ نہیں سن رہی تھی۔وہ وہیں کھڑی تھی۔ساکت۔بے جان۔اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں اور سانسیں سینے میں بری طرح الجھ رہی تھیں۔اسٹریچر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔زہرہ بیگم اندر چلی گئیں۔دروازہ بند ہو گیا۔اور نجف وہیں رہ گئی۔ایک لمحہ۔دو لمحے۔پھر جیسے کسی نے اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔وہ اچانک پلٹی۔سقراط کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔نیمل کے چہرے پر حیرت تھی۔سلال کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔سرمد صاحب نے بھی سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔مگر نجف نے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔وہ تقریباً بھاگتی ہوئی راہداری میں آگے بڑھ گئی۔ وہ بنا پیچھے دیکھے راہداری کے آخری سرے تک گئی اور اگلے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔پیچھے صرف خاموشی رہ گئی۔سقراط کی نظریں اسی سمت جمی رہیں جہاں نجف غائب ہوئی تھی۔اس کے چہرے پر پہلی بار تشویش صاف دکھائی دے رہی تھی۔

☆...☆...☆

بزدار پیلس شان سے کھڑا تھا۔بلند کھڑکیوں کے پار آسمان ابھی سیاہی میں ڈوبا ہوا تھا،البتہ مشرق کی سمت کہیں بہت دور ہلکی سی سفیدی جنم

لے رہی تھی۔محل کے بیشتر حصے خاموش تھے۔صرف چند ملازم جاگ چکے تھے جو دبے قدموں سے اپنے روزمرہ کے کام نمٹا رہے تھے۔مگر اس خاموشی کو ایک بے تاب وجود چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔وہ نجف تھی۔وہ بھاگ رہی تھی۔ہسپتال سے نکلنے کے بعد وہ سیدھی گھر آئی۔نہ کسی سے بات کی، نہ کسی نے اسے روکا۔اس کے قدم تیز تھے، جیسے وہ خود سے بھاگ رہی ہو۔آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔وہ انہیں پونچھ بھی نہیں رہی تھی۔اس کے ذہن میں صرف ایک سوال گونج رہا تھا۔

"اکتیس سال پہلے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی، پھر انہیں مٹھی میں بھینچ لیتی۔وہ اندھیرا...وہ لمس...اور وہ خوفناک یقین کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی، وہ محض خواب نہیں تھا۔اسے جواب چاہیے تھا۔اور اس جواب کا آغاز ایک ہی جگہ سے ہوسکتا تھا۔امجد بزدار۔وہ تیز قدموں سے محل کے اس حصے کی طرف بڑھی جہاں امجد بزدار اور نیلوفر بیگم کا کمرہ تھا۔دروازے تک پہنچتے ہی اس نے ایک لمحے کو بھی سانس درست کرنے کی کوشش نہیں کی، اگلے ہی پل اس کا ہاتھ آگے بڑھا اور ٹھاہ کی آواز سے، دروازہ پوری شدت سے کھل گیا۔وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔کمرے میں ملگجی سی روشنی تھی۔بستر کے دونوں جانب امجد بزدار اور نیلوفر بیگم پرسکون نیند سو رہے تھے۔دروازہ کھلنے کی آواز پر نیلوفر بیگم گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔انہوں نے فوراً دائیں جانب جھک کر لیمپ جلایا۔
زرد روشنی کمرے میں پھیلی۔اور سامنے نجف کھڑی تھی۔بکھرے بال، بھیگا ہوا چہرہ، سرخ آنکھیں اور کپکپاتا ہوا وجود۔ہاں وہ واقعی اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

" کیا بدتمیزی ہے یہ، نجف؟" نیلوفر بیگم کی آواز میں غصہ تھا۔امجد بزدار بھی اٹھ بیٹھے۔چند لمحے تک وہ حیرت سے اپنی بیٹی کو دیکھتے رہے۔پھر ان کے لہجے میں تشویش اتر آئی۔

" کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے؟"

نجف کے ہونٹ کانپے۔وہ بولنے کی کوشش کرتی رہی، مگر گلے میں پھنسے آنسوؤں نے آواز روک دی۔پھر اچانک وہ پھٹ پڑی۔

" آپ لوگوں نے کیا کیا تھا میرے ساتھ؟"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔نیلوفر بیگم نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

" کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"اکتیس سال پہلے!" نجف نے اپنے آنسو بے دردی سے پونچھے۔"اکتیس سال پہلے کیا کیا تھا میرے ساتھ؟"

امجد بزدار کے چہرے پر ایک لمحے کو پریشانی ابھری۔صرف ایک لمحے کے لیے۔

"نجف، بات کیا ہے؟"

"جب میں پیدا ہوئی تھی..."اس کی آواز ٹوٹ گئی۔وہ آگے بڑھی۔"جب میں پیدا ہوئی تھی تو مجھ پر کیا تجربہ کیا تھا؟"

نیلوفر بیگم کا چہرہ یکدم بدل گیا۔انہوں نے گہری سانس کھینچی اور جیسے کسی شدید درد سے بچنے کے لیے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔امجد بزدار خاموش رہے۔لفظ 'اکتیس سال' نے ان کے چہرے پر جو تشویش پیدا کی تھی، وہ اگلے ہی لمحے عجیب سی بے فکری میں بدل گئی۔

"ہوا کیا ہے، نجف؟"

اس بار ان کی آواز نرم تھی۔نجف نے اپنے باپ کو غور سے دیکھا۔وہ چہرہ جس پر اس نے ہمیشہ اختیار دیکھا تھا۔وہ آنکھیں جن میں آج اسے کچھ چھپا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

" آپ جانتے ہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

یہ سوال نہیں تھا۔یہ بے بسی تھی۔اسکے ساتھ جو ہو رہا تھا وہ نارمل ہرگز نہیں تھا۔
امجد بزدار نے لب کھولے مگر اس سے پہلے نیلوفر بیگم کی سرد آواز کمرے میں گونجی۔

"نہیں جانتے۔" نجف نے فوراً ان کی طرف دیکھا۔ "لیکن جو تم نے ہمارے ساتھ کیا ہے، وہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔" ان کی آواز میں برسوں کی ناراضی جمع تھی۔

"اب جاؤ۔ سکون سے سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔"

نجف چند لمحے ساکت کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ وہ جس جواب کے لیے یہاں تک بھاگتی ہوئی آئی تھی، اسے پھر وہی خاموشی مل گئی تھی۔ اس نے امجد بزدار کو دیکھا۔ شاید وہ کچھ کہیں گے۔ شاید وہ اسے روکیں گے۔ مگر وہ بھی خاموش رہے۔ نجف کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اس نے اپنی مٹھیاں بند کیں، آنکھوں میں جمع آنسوؤں کو واپس دھکیلا اور ایک لفظ کہے بغیر پلٹ گئی۔ دروازے تک پہنچی۔ ایک لمحے کے لیے رکی۔ پھر دروازہ پوری شدت سے بند ہوا۔ زوردار آواز ابھری اور پھر کمرے میں بھاری خاموشی چھا گئی۔ امجد بزدار کی نظریں بند دروازے پر جمی رہیں۔ نیلوفر بیگم نے تھکے ہوئے انداز میں سر جھٹکا۔

"مُجھے لگتا ہے نجف کو ہماری ضرورت ہے۔" امجد بزدار نے آہستہ سے کہا۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد بولے، "خاص طور پر تمہاری، نیلوفر! اس سے بات کرنے کی کوشش کرو۔"

نیلوفر بیگم نے تلخی سے ان کی طرف دیکھا۔

"جو زخم کو اس نے مُجھے دیا ہے نا... میرا دل نہیں کرتا اس کی شکل دیکھنے کو۔"
ان کی آواز میں دکھ اتر آیا۔ امجد خاموش رہے۔

"آپ کریں اپنی لاڈلی سے بات۔" نیلوفر بیگم نے کروٹ بدلی، لیمپ بند کیا اور کمبل اپنے سر تک کھینچ لیا۔ "مُجھے نہیں کرنی کوئی بات۔"

کمرہ دوبارہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ امجد بزدار لیٹے ضرور تھے مگر ان کی آنکھیں بند نہیں ہوئیں۔ ان کی نظریں اب بھی اسی دروازے پر تھیں جہاں سے نجف ابھی ابھی نکلی تھی۔ چہرے پر تفکر کی گہری لکیریں ابھر آئی تھیں۔ اور اس وقت... انہیں یہ خیال پہلے سے زیادہ خطرناک محسوس ہوا کہ شاید ماضی واقعی واپس آ گیا تھا۔

☆...☆...☆

آپریشن تھیٹر کی سرخ بتی کو روشن ہوئے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔اندر وقت جیسے رک گیا تھا۔مشینوں کی مسلسل بیپ ، مانیٹر پر اوپر نیچے ہوتی لکیریں،سرجنز کی تیز مگر دبی ہوئی آوازیں اور جراثیم کش دوا کی تیز بو،سب کچھ معمول کے مطابق ہونا چاہیے تھا،مگر آج اس سفید کمرے میں معمول نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔زہرہ بیگم کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی۔سرجری شروع ہونے سے پہلے ہی ان کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک گر گیا تھا۔دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو رہی تھی۔

"پریشر دوبارہ گر رہا ہے۔"

ایک آواز بلند ہوئی۔

"انکوٹائٹریٹ کریں۔"

حق کی آواز گونجی۔وہ سرجن کی مخصوص پوشاک میں زہرہ بیگم کے قریب کھڑا تھا۔اس کی آنکھیں مانیٹر پر جمی تھیں،مگر وہ جانتا تھا کہ وہ صرف ایک مریضہ نہیں تھیں۔
یہ ماں جیسی تھیں۔وہ عورت جس نے اسے اپنے گھر کے دروازے سے کبھی اجنبی ہو کر واپس نہیں جانے دیا تھا۔آج ان کی زندگی اس کے ہاتھوں میں تھی۔

" کمنگ ڈاؤن..."

اینستھیز یا ٹیم کی آواز آئی۔حق نے دانت بھینچ لیے۔

"ہم انہیں کھونے نہیں دے سکتے۔"

سب جانتے تھے۔یہ اب معمول کی سرجری نہیں رہی تھی۔باہر راہداری میں نیمل کے قدم جیسے اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔وہ کافی دیر سے

کھڑی تھی، مگر اب اچانک اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ اب بھی دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔

"یا اللہ... میری امی کو واپس کر دیں۔"

سقراط سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر سرمد صاحب کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ان دونوں کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ مگر کسی میں پانی پینے کی ہمت نہیں تھی۔ اور سلال کب کسی کو دھکیل کر آپریشن تھیٹر کے قریب پہنچا، کسی کو معلوم نہیں ہوا۔

"سلال!"

کسی نے اسے روکنا چاہا۔ مگر وہ نہیں رکا۔ حق نے سر ہلا کر اسے اندر آنے دیا۔ وہ اندر پہنچ چکا تھا اور اب وہ اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ وہی چہرہ جو ہمیشہ اسے دیکھ کر مسکراتا تھا۔ آج بے رنگ تھا۔

"امی..."

اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ زہرہ بیگم نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ سلال چند قدم آگے بڑھا۔

"امی، میں یہاں ہوں۔"

اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اسکا وجود کانپ رہا تھا۔ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ جو ہمیشہ اس کے بال سنوارتا تھا۔ جو بخار میں اس کی پیشانی پر رکھا جاتا تھا۔
جو اسے ڈانٹتے ہوئے بھی آخر میں پیار سے چھو لیا کرتا تھا۔ آج وہ ہاتھ سرد پڑ رہا تھا۔

"امی... آپ مُجھے سن رہی ہیں نا؟"

کوئی جواب نہیں آیا۔ مانیٹر کی آواز تیز ہو رہی تھی۔ بیپ۔ بیپ۔ بیپ۔ حق نے ایک لمحے کے لیے سلال کی طرف دیکھا۔

"سلال، باہر جاؤ۔"

"نہیں!" وہ بچوں کی طرح پھٹ پڑا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "امی اکیلی نہیں جائیں گی۔"

حق کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا۔ "سلال..."

"نہیں!" اس نے زہرہ بیگم کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا۔

"امی، آپ نے کہا تھا نا آپ مُجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گی۔ آپ نے کہا تھا میری گریجویشن دیکھیں گی..." وہ سسکا۔ "آپ نے کہا تھا میں چاہے جتنا بڑا ہو جاؤں، آپ کے لیے بچہ ہی رہوں گا..."

اس کے آنسو زہرہ بیگم کی انگلیوں پر گر رہے تھے۔

"پھر اٹھیں نا امی..." اس نے ان کا ہاتھ اپنے گال سے لگا لیا۔ "میں بڑا نہیں ہونا چاہتا۔"

زہرہ بیگم کے سینے میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ حق فوراً متوجہ ہوا۔

"پریشر؟"

مانیٹر پر لکیریں ایک لمحے کے لیے بے ترتیب ہوئیں۔

"کمنگ ڈاؤن!"

حق نے پوری قوت سے کوشش کی۔

" کمنگ آن، پھو پھو!"

اسکے لبوں سے دھیمے سے پھسلا مگر جسم جیسے اس جنگ سے تھک چکا تھا۔ زہرہ بیگم کی سانس ایک بار اٹکی۔ پھر دوسری بار۔ ان کی پلکیں ہلیں۔ سلال نے ان کا ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام لیا۔

"امی..."

زہرہ بیگم کے ہونٹ ذرا سے ہلے۔ کوئی لفظ نہیں نکلا۔ صرف ایک کمزور سی سانس۔
پھر...ایک آخری، گہری سسکی۔ اور مانیٹر پر چلتی لکیر سیدھی ہوگئی۔ بیپ .....سلال کے چہرے سے جیسے خون نچڑ گیا۔

"نہیں..." اس نے سر جھٹکا۔ "نہیں، امی..."

وہ زہرہ بیگم کا ہاتھ ہلانے لگا۔

"امی اٹھیں..." موت کی خاموشی چھا گئی۔ "امی!"

اس کی آواز آپریشن تھیٹر کی سفید دیواروں سے ٹکرائی۔

"امی نہیں!"

آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ وہ بلک رہا تھا۔

"امی اللہ کے لیے اٹھ جائیں..."

حق کی انگلیاں چندلمحوں کے لیے وہیں رک گئیں۔اس نے مانیٹر کو دیکھا۔پھر زہرہ بیگم کو۔پھر سلال کو۔اس کے قدم جیسے زمین میں دھنس گئے۔وہ ڈاکٹر تھا۔مگراس لمحے وہ ڈاکٹر نہیں تھا۔وہ صرف ایک بھتیجا تھا۔اوراس کے سامنےاس کی پھوپھو جا چکی تھیں۔اس کے قدم ایک لمحے کولڑکھڑائے۔وہ آگے بڑھا۔سلال نے سر اٹھایا۔اس کی آنکھوں میں وہ وحشت تھی جو کسی بچے کی آنکھوں میں تب آتی ہے جب اسے پہلی بار معلوم ہوتا ہے کہ موت واقعی کسی کو واپس نہیں کرتی۔

"انا..."

سلال کے لب کانپے۔

"انا...اللہ..."

اس کے بعداس کی آواز ٹوٹ گئی۔حق نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔مگر کوئی لفظ نہیں نکلا۔سلال نے اپنا کپکپاتا آہستہ سے ہاتھ بڑھایااوراپنی ماں کی کھلی آنکھوں پر رکھا۔بہت نرمی سےان کی پلکیں بند کردیں۔اور پھر وہ اپنی ماں کے سینے پر گر پڑا۔

"امی!"

اس کی چیخ نے آپریشن تھیٹر کی خاموشی چیر دی۔

"امی،مُجھے چھوڑ کرنہیں جائیں..."

وہ ان سے لپٹا ہوا تھا۔

"امی میں آپ کے بغیر کیا کروں گا؟"

اس کے ہاتھ زہرہ بیگم کے لباس کو مٹھیوں میں بھینچ رہے تھے۔

"آپ تو کہتی تھیں نا میں آپ کا بیٹا ہوں..."

وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔

"پھر مُجھے اکیلا کیوں کر دیا؟"

حق نے اذیت سے آنکھیں بند کر لیں۔ نیمل نے اچانک دعا کے لیے اٹھے ہاتھ سینے سے لگا لیے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ مگر دل نے جیسے خبر پہلے ہی سن لی تھی۔ سقراط نے آنکھیں کھولیں۔ سرمد صاحب کی تسبیح رک گئی۔ تینوں نے آپریشن تھیٹر کے بند دروازے کو دیکھا۔ اور شبگیر ہاؤس میں، اس وقت دادی، تارہ، نوفہ اور نامرہ بھی ہاتھ اٹھائے بیٹھی تھیں۔

"یا اللہ ہماری امی کو ٹھیک کر دیں..."

معصوم ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے تھے۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ جس کے لیے وہ دعا مانگ رہی تھیں، اس کی روح اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ آپریشن تھیٹر میں اب مشینیں خاموش تھیں۔ ڈاکٹر خاموش تھے۔ سلال کی سسکیاں بھی کچھ دیر بعد مدھم پڑنے لگی تھیں۔ اور سفید روشنی میں زہرہ بیگم بالکل پرسکون لیٹی تھیں۔ جیسے ابھی آنکھیں کھول کر کہیں گی۔

"رو کیوں رہے ہو؟ میں تو یہیں ہوں۔"

مگر اس بار وہ آنکھیں نہیں کھلیں۔

☆...☆...☆

شبگیر ہاؤس کا صحن جو کبھی زہرہ بیگم کی محبت، شفقت اور قدموں کی چاپ سے آباد رہتا تھا، آج ایک ہولناک منظر پیش کر رہا تھا۔ سفید رنگ کی

ایمبولینس کا سائرن جب گلی کے موڑ پر بجا، تو ایسا لگا جیسے پورے شبگیر ہاؤس پر ایک ساتھ سو قیامتیں ٹوٹ پڑی ہوں۔ گاڑی کے رکتے ہی جب عقبی دروازہ کھلا اور زہرہ بیگم کا سفید چادر میں لپٹا بے جان وجود سٹریچر پر باہر لایا گیا، تو گھر کے در و دیوار سے حسرت اور درد کی ایسی چیخیں ابھریں کہ سننے والوں کی روح کانپ گئی۔

نامرہ اپنی ماں کا یہ بے حس و حرکت روپ دیکھنے کے لیے کسی طور تیار نہیں تھی، ایمبولینس کا دروازہ کھلتے ہی اپنے حواس کھو بیٹھی۔ اس کے منہ سے ایک آدھی چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر جا گری۔ دوسری طرف نیمل کے پاس بہانے کو اب جیسے ایک آنسو بھی باقی نہیں بچا تھا۔ وہ ہسپتال میں زہرہ بیگم کے بیڈ کے پاس اپنے تمام آنسو بہا چکی تھی۔ اس کی آنکھیں سوکھ کر پتھرا چکی تھیں اور چہرہ ایک خشک، زرد ویرانے کی مانند تھا جہاں اب صرف چھایا ہوا تھا۔ سرمد صاحب کی تو جیسے کائنات ہی لٹ گئی تھی۔ جن کے ساتھ زندگی کی اٹھائیس بہاریں دیکھی تھیں، وہ شریکِ حیات یوں لمحوں میں ہاتھ چھڑا کر چلی جائے گی... یہ صدمہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ ان کے قدموں تلے سے زمین نکل چکی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے، بغیر کسی سے نظریں ملائے، صحن کے ایک کونے میں ششدر و لاچار بیٹھے دیوار کو تک رہے تھے۔

تارہ اور نوفہ، اپنے معصوم وجود کے ساتھ زہرہ بیگم کی میت سے لپٹ کر بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

"امی... امی اٹھیں نا! دیکھیں ہم آپ کے پاس ہیں... امی ایک بار ہمیں دیکھ لیں۔"

ان کی سسکیوں سے پورا گھر دہل رہا تھا۔ دادی اماں خود غم سے ڈھال تھیں، پھر بھی ان بچیوں کو سینے سے لگانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر ان کی اپنی لرزتی بانہیں انہیں سنبھالنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھیں۔ سچ ہی تو ہے... کبھی کبھی قیامتیں دھماکے کے ساتھ نہیں آتیں، وہ خاموشی سے آتی ہیں، خاموشی سے گھروں کو اجاڑتی ہیں اور انسان کو اندر سے خالی کر کے چلی جاتی ہیں۔ پتا بھی نہیں چلتا کہ جیتے جی انسان کا کیا کچھ لٹ گیا۔ سلال جو آپریشن تھیٹر کے باہر اپنے تمام تر آنسو پونچھ کر، دل پر پتھر رکھ کر نکلا تھا، اب مضبوط بن کر اپنے گھر والوں کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ٹوٹ گیا تو اس کا پورا گھر بکھر جائے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر زمین پر بلکتی ہوئی تارہ اور نوفہ کو اٹھایا اور اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

"سلال بھائی... امی کہاں چلی گئیں؟ وہ ہمیں اکیلا چھوڑ کر کیوں گئیں؟" تارہ نے اس کی قمیض کو گرفت میں لیتے ہوئے ہچکیوں کے درمیان پوچھا۔ سلال نے تارہ کی پیشانی پر اپنے کپکپاتے لب رکھے، اس کی اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر طوفان اٹھ رہا تھا مگر اس نے بڑی مشکل سے اپنے لہجے کو ٹوٹنے سے بچایا۔

"امی کہیں نہیں گئیں تارہ... وہ اللہ کے پاس گئی ہیں۔ وہ اب تکلیف میں نہیں ہیں، وہ ہمیں دیکھ رہی ہیں... اگر تم ایسے روؤ گی تو امی کو تکلیف

ہوگی۔"

"لیکن بھائی...اب ہمیں صبح کون اٹھائے گا؟ ہماری بات کون سنے گا؟" نوفہ نے سلال کے گلے میں بانہیں ڈال کر تڑپتے ہوئے کہا۔سلال نے نوفہ کے گالوں سے آنسو پونچھے، پھر صوفے پہ پڑی بے ہوش نامرہ کے پاس جھکا اور اس کے سر کو اپنی گود میں رکھ کر اس کی پیشانی کو چوما۔

"اٹھ جاؤ نامرہ امی کو دیکھ لو...ہم پھر کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔"

نامرہ کو جب ہوش آیا تو وہ سلال کی گود میں سر رکھے زاروقطار رو پڑی۔

"سلال...سلال...امی..."اسکی ہچکیوں کے درمیان الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔سلال اپنی بہنوں کو اپنے وجود میں سمیٹے، اندر ہی اندر گھٹتا جا رہا تھا مگر اس نے اپنے آنسو ان کے سامنے گرنے نہ دیے۔مغرب کے بعد زہرہ بیگم کی تدفین کا وقت طے پایا۔

شبگیر ہاؤس کا صحن اور گلی مردوں سے بھر چکی تھی۔بزدار خاندان...جو ان کے جیتے جی کبھی ان کا حال پوچھنے نہ آئے تھے، جن کے انتظار میں زہرہ بیگم کی آنکھیں برسوں تک پتھرا گئی تھیں...آج ان کے مرنے کے بعد دکھاوا کرنے آ چکے تھے۔
نیلوفر بیگم تو نہیں آئیں، مگر زنان خانہ میں منیبہ بیگم، عالیہ اور نجف موجود تھیں۔نجف کے چہرے کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔اس کے چہرے پر ایسی زردا اور بھیانک وحشت طاری تھی کہ اگر اس کے جسم پر نشتر بھی چلا دیا جاتا تو لہو کا ایک قطرہ نہ نکلتا۔اس کی نظریں نیمل اور زہرہ بیگم کے بے جان وجود پر جمی رہیں اور اس کے اندر پچھتاوے، دکھ اور خود ملامتی کا لاوا ابل رہا تھا۔عالیہ خاموشی سے ایک کونے میں کھڑی، سلال اور اس کے بکھرے ہوئے خاندان کو دیکھ کر دیکھ رہی تھی۔

دوسری طرف جنازگاہ کے باہر بزدار خاندان کی لمبی، چمکتی ہوئی گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔امجد بزدار، شمس، اقبال، حکمت، ثالث اور حق...تقریباً پورا بزدار خاندان وہاں موجود تھا۔مغرب کے فوراً بعد جنازہ اٹھایا گیا۔

سلال نے اپنے کپکپاتے کندھوں پر اپنی ماں کی میت کا بوجھ اٹھایا۔سقراط اندر سے مکمل طور پر ٹوٹ چکا تھا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی باقی بچوں کی طرح چیخ چیخ کر روئے، مگر وہ رو نہیں سکتا تھا۔قبرستان کی بھیگی اور ٹھنڈی مٹی کی بو کے درمیان، زہرہ بیگم کو ان کی ابدی آرام گاہ پر

لایا گیا۔سرمد صاحب بالکل سن کھڑے تھے۔ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ امجد بزدار اور اس کے پورے قبیلے کو دھکے دے کر، ذلیل کر کے یہاں سے نکال دیں...مگر وہ اس وقت اتنے بے بس تھے کہ اپنے ہاتھوں کو اٹھا بھی نہ سکے۔زہرہ ان کی بیٹی تھی...وہی زہرہ جو سالوں اپنے بھائیوں اور باپ کے ایک فون، ایک قدم کے لیے ترستی رہی تھی اور آج مرنے کے بعد وہ سب اس کے جنازے میں شریک ہو کر صفِ اول میں کھڑے تھے۔جو جیتے جی نہیں آتے وہ مرنے پہ کیوں آجاتے ہیں؟

لحد کی گہرائی میں اتارے جانے کا وہ لمحہ سچ مچ روح کو فنا کر دینے والا تھا۔سلال، سرمد صاحب اور امجد بزدار نے اپنے لرزتے اور کانپتے ہاتھوں سے زہرہ بیگم کو مٹی کی آغوش میں اتارا۔سرمد صاحب نے جب اپنی شریکِ حیات کے چہرے سے آخری بار کپڑا ہٹا کر مٹی ڈالنا شروع کی، تو ان کا ہاتھ فضا میں ہی جم گیا۔ان کی آنکھوں سے دو گرم آنسو نکل کر اس تازی کھدی مٹی میں جذب ہو گئے۔ان کی زہرہ... ہمیشہ کے لیے مٹی کے تلے سو چکی تھیں۔اور مرنے والے...مرنے والے کبھی واپس نہیں آتے! تدفین مکمل ہونے کے بعد تاریکی مزید گہری ہو گئی۔آہستہ آہستہ جنازے میں شریک تمام لوگ، عزہ و اقارب اور بزدار خاندان کی گاڑیاں ایک ایک کر کے واپس لوٹنے لگیں۔
سقراط نے بے حد مشکل سے سرمد صاحب کو سنبھالا اور انہیں واپس شبگیر ہاؤس لے آیا تا کہ وہ گھر کی بچیوں کو سنبھال سکیں۔مگر...سلال نہیں گیا۔وہیں زہرہ بیگم کی تازہ، نم آلود قبر کے پاس...سلال زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا رہا۔اس کی ماں نیچے اس اندھیرے میں تھیں...وہ کہاں جاتا؟ وہ انہیں اس پہلی، تنہا رات اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا؟ قبرستان میں گھپ اندھیرا اور ہولناک سکوت چھایا ہوا تھا، صرف ہوا کے سرسرانے اور درختوں کے پتوں کی آواز آ رہی تھی۔سلال بھیگی آنکھوں، سوجے ہوئے چہرے اور خشک، پیاسے لبوں کے ساتھ اپنی ماں کی قبر پر ہاتھ رکھے، ان کے لیے سورہ فاتحہ اور قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔اس کی آواز اندھیروں میں لرزتی ہوئی گونج رہی تھی۔

"امی...میں یہی ہوں...میں آپ کے پاس ہوں۔آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے امی...آپ کا سلال یہی بیٹھا ہے۔"

رات کا جانے کون سا پہر بیت گیا۔تاریکی مزید گہری اور ہوا مزید یخ بستہ ہوتی چلی گئی، مگر سلال وہیں بغیر کسی حرکت کے، مٹی کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے ہوئے بیٹھا رہا۔اس کا جسم ٹھنڈ سے اکڑ رہا تھا مگر دل کے اندر کی تپش بجھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔اور پھر...رات کے کسی پہر، ویران قبرستان کی خاموشی میں گاڑی کے ٹائروں کی آواز ابھری۔سقراط واپس آیا تھا۔وہ اپنے بھائی کے بیٹے، اپنے سلال کو اس ویرانے سے گھر واپس لے جانے آیا تھا۔سقراط کے قدم مٹی پر چلتے ہوئے سلال کے قریب آ کر رک گئے۔اس نے جھک کر سلال کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"سلال...گھر چلو بیٹا۔"

سلال نے جیسے ہی سقراط کی آواز سنی، اس کے اندر کا سارا ضبط ایک ہی پل میں کافور ہو گیا۔ وہ دلدوز سسکی کے ساتھ زمین سے اٹھا اور تڑپ کر سقراط کے سینے سے لپٹ گیا۔ وہ سقراط کے ساتھ لٹک کر، بچوں کی طرح زار و قطار رو پڑا۔ اس کی سسکیاں اس ویران قبرستان کی در و دیوار کو لرزا رہے تھے۔ آج اس کے اندر کا وہ بچپنا اور وہ مان ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا جو صرف ماں کی موجودگی سے قائم رہتا ہے۔ اب اسے سننے والا، اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

"چاچو... چاچو میری امی...!" سلال سقراط کی قمیض کو اپنے ہاتھوں میں سختی سے جکڑے، تڑپتے ہوئے بولا، "چاچو! میری امی مُجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں... میں انہیں نیچے اس اندھیرے میں کیسے چھوڑ دوں چاچو؟ میری امی کو ڈر لگتا ہے... چاچو میری امی کو واپس بلا لیں۔"

سقراط کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ اس کا اپنا دل پھٹ رہا تھا، مگر اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے سلال کو اپنے سینے میں سختی سے بھینچ لیا، اس کی پیٹھ اور سر پر بار بار ہاتھ پھیرا۔

"بس کرو سلال... بس میرے بچے! حوصلہ کرو... زہرہ بھابھی تمہیں اس طرح روتا دیکھتیں تو انہیں تکلیف ہوتی۔ تم ان کا فخر ہو سلال۔"

سقراط نے سلال کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھاما اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مضبوط ہونا ہوگا سلال.. تمہاری بہنیں گھر میں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ وہ سب ٹوٹ چکی ہیں، انہیں اس وقت اپنے بھائی کی ضرورت ہے۔ اگر تم یوں ہمت ہار گئے تو انہیں کون سنبھالے گا؟ چلو سلال... اپنی بہنوں کے لیے، اپنے باپ کے لیے..."

سلال نے ایک بار پھر تڑپ کر اپنی ماں کی قبر کی طرف دیکھا، اپنے پیاسے لبوں سے خاموش دعا کے الفاظ ادا کیے اور پھر سقراط کے سہارے، لڑکھڑاتے قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں اندھیرے کو چیرتے ہوئے واپس شبگیر ہاؤس کی طرف جا رہے تھے... ایک ایسی دنیا کی طرف جہاں اب زہرہ بیگم کی چھاؤں نہیں تھی مگر زندگی کے بھیانک امتحان اور بوجھ ان کے منتظر تھے۔

☆...☆...☆

ایک ہفتہ بیت چکا تھا...مگر شبگیر ہاؤس کے درودیوار پر زہرہ بیگم کی عدم موجودگی ایک دائمی زنگ کی طرح جم چکی تھی۔۔گھر میں تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں کا تانتا اب بھی بندھا ہوا تھا۔محلے کی عورتیں، دور کے رشتہ دار اور محلے دار مسلسل آ جا رہے تھے۔وہ آتے، روایتی دلاسے دیتے، ہمدردی کے جملے دہراتے اور چلے جاتے...مگر ان بہن بھائیوں کو کسی کے آنے یا جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ان کی آنکھیں اب آنسوؤں سے خالی ہو کر خشک ہو چکی تھیں اور دل جیسے اندر سے سن اور مردہ ہو چکے تھے۔کچن میں چولہا اب زہرہ بیگم کی محبت سے نہیں، بلکہ صرف زندہ رہنے کی مجبوری میں جلایا جاتا تھا۔ڈائننگ ہال کی کرسی پر بیٹھی دادی کی تسبیح اب خاموش سسکیوں کے ساتھ چلتی تھی اور سرمد صاحب اپنے کمرے میں ویران آنکھوں سے چھت کو تکتے رہتے۔نیمل...وہ اب پہلے والی نیمل نہیں رہی تھی۔اس کے چہرے کی نرمی ختم ہو چکی تھی۔تارہ اور نوفہ نے اپنے میٹرک کے بورڈ امتحانات کے سر پر ہونے کی وجہ سے بوجھل دل کے ساتھ دوبارہ سکول جانا شروع کر دیا تھا۔سلال اور نامرہ بھی کالج لوٹ رہے تھے۔اور سلال...اس کا تو جیسے ایک نیا، دردناک معمول بن گیا تھا۔روز مغرب کی نماز کے بعد وہ قبرستان جاتا، اپنی ماں کی قبر پر بیٹھ کر تلاوت کرتا اور بھیگی آنکھوں، خشک لبوں کے ساتھ اندھیرا ہونے پر گھر لوٹتا۔زندگی بظاہر اپنے روایتی دھارے پر واپس آ رہی تھی، مگر اندر سے کچھ بھی نارمل نہیں تھا۔

آج ساتویں دن کی رات، مغرب کے بعد، وہ پانچوں بہن بھائی ایک بار پھر اسی زرد روشنی والی لائبریری موجود تھے۔اسی گول میز کے گرد، جہاں ماضی میں ان کی کھلکھلاہٹیں اور معصوم الجھنیں بکھری ہوتی تھیں...آج پانچ بجھے ہوئے، خاموش وجود بیٹھے تھے۔نیچے کچن سے اب زہرہ بیگم کی کوئی غصے بھری پکار یا چپلوں کی چاپ نہیں آتی تھی۔وہ ہولناک خاموشی پورے گھر کو نگل رہی تھی۔سلال نے خاموشی سے شیلف سے وہ دونوں ڈائریاں نکالیں، نیلی D اور سرخ N4 اور انہیں میز کے مرکز میں رکھ دیا۔وہ سب ہمیشہ کی طرح اپنی اپنی کرسی پہ بیٹھ گئے۔

"امی کی وفات کو ایک ہفتہ ہو گیا..." سلال نے دھیمی آواز میں بات شروع کی۔اس کی بھوری آنکھیں سرخ تھیں اور ان میں روز کی شب بیداری کی تھکن تھی۔"زندگی دوبارہ چلنے لگی ہے...ہم سکول جا رہے ہیں، کالج جا رہے ہیں، کھانا کھا رہے ہیں...مگر ایسا لگتا ہے جیسے اندر سے ہم سب وہیں کھڑے ہیں، اس ہسپتال کے راہداری میں..."

نیمل نے سلال کے لرزتے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔اس کی اپنی آنکھوں میں ویرانی تھی، مگر سلال کے لیے اس کے لمس میں بلا کی نرمی اور اپنائیت تھی۔

"سلال...تم ہر روز مغرب کے بعد وہاں جاتے ہو، ہم جانتے ہیں تمہارا دل کتنا بھاری ہے، مگر خود کو یوں گھولنا نہیں ہے۔امی کبھی نہیں چاہیں گی کہ ان کا سلال یوں ٹوٹ جائے۔"

"میں ٹوٹ نہیں رہا آپی..." سلال نے ایک بوجھل مسکراہٹ کے ساتھ نیمل کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھا، "بس...بس جب وہاں بیٹھتا ہوں تو لگتا ہے امی پاس ہیں۔"

نامرہ جو ہمیشہ کرسی پر بے پروا بیٹھی رہتی تھی، آج اس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر تارہ اور نوفہ کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"آج میں جب کالج گئی..." اس کی آواز بھرائی، "تو ہر لمحہ لگا کہ ابھی گھر لوٹوں گی تو امی کچن میں ہوں گی۔ ان کی وہ غصے بھری پکار سنے بغیر زندگی اتنی خالی لگتی ہے کہ سانس لینا بھی مشکل ہوتا ہے۔"

"مُجھے بھی..." تارہ نے نامرہ کے شانے سے اپنا سر ٹکا دیا، آنسو اس کے گال پر ڈوب کر بہہ گئے۔ "سکول میں جب سب نارمل تھا، تو مُجھے رونا آرہا تھا کہ باہر کی دنیا میں کچھ بھی نہیں بدلا...ہماری امی چلی گئیں اور دنیا ویسے ہی چل رہی ہے۔"

"یہی دنیا کا نظام ہے تارہ..." سلال نے تارہ کے سر پر ہاتھ رکھا، اس کا لہجہ ایک شفیق باپ جیسا ہو گیا تھا، "لوگ اپنی زندگیوں میں مگن رہتے ہیں، مگر جن کا نقصان ہوتا ہے، انہیں ہی ایک دوسرے کا سہارا بننا پڑتا ہے۔ امی چلی گئیں، مگر وہ ہمیں ایک دوسرے کے پاس چھوڑ کر گئی ہیں۔ اگر ہم یوں بکھر گئے تو پاپا کا کیا ہوگا؟ دادی کا کیا ہوگا؟"

نوفہ نے اپنے گال سے آنسو پونچھے اور سلال کو دیکھا۔

"سلال بھائی...کیا ہم واقعی اب پہلے کی طرح جی پائیں گے؟ کیا ہمارا یہ گھر کبھی دوبارہ ہنسے گا؟"

سلال نے ایک گہری سانس لی۔ اس نے اپنی تمام بہنوں کو باری باری دیکھا، ان کی آنکھوں میں چھپا ہوا دکھ اور ان کا معصومانہ خلوص بھی۔

"ہم ہنسیں گے بھی، ہم جئیں گے بھی..." سلال نے ان سب کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا، "امی کی یادیں ہمارے ساتھ ہیں، ان کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں۔ دکھ بڑا ہے، مگر ہمارا اتحاد اس سے بھی بڑا ہے۔ ہم ایک دوسرے کا مرہم بنیں گے۔ جب پاپا اداس ہوں گے تو ہم انہیں

سنبھالیں گے۔ جب تم تینوں میں سے کسی کا دل بوجھل ہوگا، میں اور آپی تم لوگوں کا ہاتھ تھامیں گے۔"

نیمل نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ سلال کی طرف دیکھا۔

"اور جب سلال تھک جائے گا...تو اس کی چاروں بہنیں اس کی ڈھال بنیں گی۔"

اس ایک جملے نے کمرے کا سارا بوجھ جیسے ہلکا کر دیا۔ ان کے چہروں پر سات دن کے بعد ایک نرم، تسلی بخش اور پُرنعمت مسکراہٹ ابھری۔ غم ختم نہیں ہوا تھا، مگر اس غم کو مل کر سہنے کا حوصلہ ان کے اندر بیدار ہو چکا تھا۔ نیمل نے سرخ ڈائری N4 کو کھولا اور قلم اٹھا کر صرف ایک جملہ لکھا

"ہم زخمی ہیں، مگر ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہم ایک دوسرے کا مرہم ہیں، اور ہم اپنی ماں کی دی ہوئی تربیت اور اخلاق کے ساتھ زندگی کی طرف واپس لوٹیں گے۔"

سلال نے اپنی نیلی ڈائری D میں لکھا۔

"زندگی کا نظام چلتا رہے گا، اور میں اپنی بہنوں کی مسکراہٹ اور ان کے خوابوں کی حفاظت اسی طرح کروں گا جیسے امی چاہتی تھیں۔"

انہوں نے دونوں ڈائریوں کو بند کر کے دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر رکھا۔
باہر کی دنیا ظالم اور بے حس ہو سکتی تھی مگر اس زرد روشنی کے نیچے، اس گول میز کے گرد، ان پانچوں بہن بھائیوں نے ایک دوسرے کی آغوش میں، ایک دوسرے کی باتوں میں مرہم ڈھونڈ لیا تھا۔

☆...☆...☆

رات کا پچھلا پہر تھا اور لاونج میں بوجھل اور دم گھوٹتا ہوا سناٹا طاری تھا۔ دادی لاؤنج میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح تھی مگر دانے بہت دیر بعد ڈھلکتے تھے۔ سرمد صاحب بھی ان کے پاس صوفے پر بیٹھے خالی نظروں سے سامنے دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں

جانے سے گھبراتے تھے۔وہ کمرہ جہاں انہوں نے زندگی کی تقریباً تین دہائیاں زہرہ کے ساتھ گزاری تھیں،اب انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔وہاں زہرہ کے دوپٹے کی خوشبو تھی،ان کا سامان تھا،مگر زہرہ خود نہیں تھیں۔

تارہ اور نوفہ تھکنے کے بعد دادی کے کمرے میں سو چکی تھیں۔اب وہ دادی کے پاس ہی سوتی تھیں۔نامرہ اپنے کمرے میں تھی،مگر وہ اب کسی سے بات کم ہی کرتی تھی جیسے اس کے الفاظ ہی ختم ہو چکے ہوں۔سلال حسب معمول اوپر تھا،اور سقراط ابھی تک باہر سے لوٹا نہیں تھا۔جبکہ چغلی خان اب خاموش رہتا تھا۔وہ شور نہیں کرتا تھا۔اس وقت بھی لاونج میں لٹکے پنجرے میں دبکا پڑا تھا۔ایک کونے میں رکھے استری اسٹینڈ کے سامنے نیمل کھڑی تھی۔وہ نہایت خاموشی سے سرمد صاحب کی قمیض استری کر رہی تھی۔استری کے گرم کپڑے سے اٹھتی بھاپ اس کے زرد چہرے کو چھو کر گزر جاتی۔نیمل نے قمیض کو نہایت سلیقے سے استری کیا،اسے ہینگر میں ڈالا اور اسٹینڈ کی راڈ پر لٹکا کر دادی اور سرمد صاحب کی جانب بڑھی۔میز پر چائے کے دو خالی کپ رکھے تھے۔اس نے خاموشی سے وہ کپ اٹھائے اور کچن میں چلی گئی۔کچن سے نلکے کے چلنے اور برتنوں کے ٹکرانے کی ہلکی سی آواز آئی۔اس کے کچن میں جاتے ہی دادی اور سرمد صاحب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ان کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے لفظوں سے زیادہ گہرا دکھ اور بے بسی تیر رہی تھی۔دونوں نے اشاروں کنایوں میں ایک دوسرے سے نیمل کی اس خاموشی اور بدلی ہوئی حالت کا دکھ بانٹا۔چند لمحات بعد،برتن دھو کر انہیں الٹا رکھنے کے بعد نیمل واپس لاؤنج میں آئی۔وہ بلا تاخیر دوبارہ استری اسٹینڈ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔اب وہ شاور سے تارہ اور نوفہ کے سکول یونیفارم پر پانی چھڑک رہی تھی۔ شُھھھ ...شُھھھ ...کی آواز لاؤنج کے سناٹے میں صاف گونج رہی تھی۔سرمد صاحب نے اپنا بوجھل گلہ کھنکارا۔

"تم...تم کورٹ کب سے جاؤ گی نیمل؟"بالآخر سرمد صاحب نے اپنی لرزتی آواز کو مجتمع کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں اب کورٹ نہیں جاؤں گی۔"نیمل نے شاور کا بٹن دباتے ہوئے بالکل سپاٹ اور خشک لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟"سرمد صاحب اپنی جگہ پر بے چین ہو اٹھے۔ان کا دل کٹ رہا تھا۔وہ اپنی ذہین بیٹی کو یوں جیتے جی مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

" گھر کو میری ضرورت ہے۔ویسے بھی...اب کورٹ جانے کا دل نہیں کرتا۔"اس کا لہجہ اتنا بے تاثر تھا کہ سننے والے کا کلیجہ سہم جائے۔دادی اور سرمد صاحب دونوں کے چہروں پر شدید تاسف اور دکھ ابھر آیا۔

"لیکن تمہیں تو اپنے پیشے سے محبت تھی نا...تم اسکے بنا جی نہیں سکتی تھیں۔" دادی نے خود پر قابو پاتے ہوئے عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں تھی...لیکن اب نہیں رہی۔" وہ استری کپڑے پر پھیرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے جواب دے رہی تھی۔اس کے بال پیچھے ایک سادہ، کسے ہوئے جوڑے میں قید تھے۔جسم پر ایک عام سا، پرانا سوٹ تھا اور چہرے پر نہ کوئی روپ تھا نہ کوئی سجاوٹ۔وہ کسی بھی زاویے سے شہر کی معروف کرمنل لائیر نیمل شبگیر نہیں لگ رہی تھی۔وہ صرف ایک نڈھال لڑکی لگ رہی تھی۔لاؤنج میں ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ بس شاور سے کپڑوں پر پانی کے قطرے گرنے اور استری کی سرسراہٹ کی آواز آ رہی تھی۔سرمد صاحب نے اپنی نشست پر آگے ہوتے ہوئے، اپنے لہجے کو معمول پر لانے کی ناکام کوشش کی۔

"تم ٹھیک ہو نا نیمل؟ اگر کوئی بات ہے...تو تم ہم سے بات کر سکتی ہو۔ہم تمہارے اپنے ہیں۔"

نیمل کے ہاتھ میں پکڑی استری ایک لمحے کے لیے سست ہوئی۔پھر اس نے ہینگر میں نوفہ کی شرٹ ڈالی اور اسٹینڈ کی طرف بڑھی۔

"میری ماں مر گئی ہے ابا.... پتا ہے ماؤں کا مر جانا کیسا ہوتا ہے؟"

سرمد صاحب اور دادی اپنی اپنی جگہ پر جیسے پتھر کے بن کر جم گئے۔سرمد صاحب کا چہرہ لمحوں میں سرخ ہوا اور آنکھوں میں پانی کا سیلاب تیرنے لگا جبکہ گلے میں آنسوؤں کا گولہ اٹک گیا۔دادی کے بوڑھے، کپکپاتے ہاتھ تھام گئے۔نیمل نے ان کے سکتوں پر کوئی خاص ردِعمل نہیں دیا۔وہ اسی سنجیدگی کے ساتھ واپس مڑی اور اگلا کپڑا استری بورڈ پر پھیلانے لگی۔سرمد صاحب نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

"اماں...میں اپنی بیٹی کے اس دکھ کا کیا کروں؟ میں اسے کیسے بتاؤں کہ اس کی ماں کے جانے سے میری اپنی روح نکل گئی ہے...میں کیسے سنبھالوں اسے؟"

دادی نے اپنی کانپتی انگلیوں سے اپنے گال پر بہتا آنسو پونچھا اور سرمد کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ خاموشی زہر ہے سرمد...زہر! زہرہ صرف ان کی ماں نہیں تھی، وہ اس گھر کی چھت تھی، اس گھر کی سانس تھی۔ جب چھت گرتی ہے نا...تو ملبے تلے دبے ہوئے لوگ فوراً نہیں بولتے، وہ صرف سانس لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیمل بھی ابھی بس سانس لے رہی ہے۔"

"کاش میں زہرہ کو بچا پاتا، ماں!" سرمد صاحب کا لہجہ شدید خود ملامتی سے بھر گیا۔

"رضائے الٰہی میں دخل نہیں دیا جا سکتا بیٹا..." دادی نے حسرت سے کچن کے اندھیرے دروازے کو دیکھا، جہاں سے اب کبھی زہرہ کی گرم روٹیوں کی خوشبو نہیں آنی تھی۔ "گھر بدل گیا ہے سرمد...ہمارا شبگیر ہاؤس پہلے جیسا نہیں رہا۔ بڑا وقت لگے گا سب ٹھیک ہونے میں۔"

ماؤں کے مر جانے سے واقعی گھر بدل جاتے ہیں۔ اینٹیں وہی رہتی ہیں، دیواروں کا روغن بھی وہی رہتا ہے، کرسیاں اور صوفے بھی اپنی جگہ پر پڑے رہتے ہیں...مگر ان کے اندر کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ ماں گھر کا کوئی فرد نہیں ہوتی، وہ گھر کی آب و ہوا ہوتی ہے۔ وہ ہوا جس میں باقی سب سانس لیتے ہیں۔ جب ماں چلی جاتی ہے، تو کچن محض ایک کمرہ بن جاتا ہے جہاں صرف پیٹ بھرنے کے لیے کھانا پکتا ہے، محبت کے لیے نہیں۔ لاؤنج کی رونقیں خاموش سوگ میں بدل جاتی ہیں۔ دروازے کی گھنٹی بجنے پر کسی کے استقبال کی وہ گرمجوشی ختم ہو جاتی ہے۔ بچے بڑے تو ہو جاتے ہیں، اپنے پاؤں پر کھڑے بھی ہو جاتے ہیں، مگر وہ اندر سے ہمیشہ کے لیے بے گھر ہو جاتے ہیں۔ جس گھر کی بنیادیں محبت، چہچہاہٹ اور شور و غل پر قائم تھیں...زہرہ بیگم کے ساتھ ہی اپنی روح کھو چکا تھا۔ اب وہ صرف بارہ مرلے کا ایک عمارت کا ڈھانچہ تھا، جہاں پانچ بہن بھائی اور ان کے گھر والے ایسے کرب سے گزر رہے تھے جس کا اختتام جانے کب ہونا تھا۔

☆...☆...☆

رات کے تقریباً ایک بجے کا وقت تھا۔ سڑک مکمل طور پر سنسنا تھی، جہاں دور دور تک کسی انسان کا نام و نشان نہیں تھا۔ سٹریٹ لائٹ کی پیلی، مدھم روشنی میں سڑک کے بالکل بیچ و بیچ درخت کی ایک بھاری، کٹی ہوئی شاخ پڑی تھی جو راستہ مکمل طور پر بلاک کر رہی تھی۔ چند گز کے فاصلے پر، سڑک کے کنارے گھنی جھاڑیوں کی تاریکی میں تین چار سائے چھپے ہوئے تھے، جن کے ہاتھوں میں سپورٹس فائبر کی مضبوط ہاکیاں چمک رہی تھیں۔

"تم لوگوں کو پکا یقین ہے نا کہ وہ آج اسی راستے سے گزرے گا؟" ایک دھیمی، خدشے سے بھری آواز ابھری۔

"ہاں، پکا یقین ہے۔ اپنے فارم ہاؤس سے شہر واپسی کا اس کے پاس یہی ایک ویران شارٹ کٹ ہے اور وہ وہاں سے نکل چکا ہے۔"
دوسری آواز نے مکمل اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

"بس پھر... آج اس فرعون کے بچے کی خیر نہیں۔" تیسری آواز میں غصے اور انتقام کی ملی جلی مٹھاس تھی۔

"زاویار! تم شیور ہو نا؟ اگر کوچ کو پتا چل گیا کہ ہم میچز کی تیاری کے بجائے سڑکوں پر ہاکیاں چلا رہے ہیں تو وہ ہم سب کو اٹھا کر ٹیم سے باہر پھینک دیں گے..." اویس نے اپنی ہاکی کی گرپ مضبوط کرتے ہوئے تھوڑی فکرمندی سے پوچھا۔ زاویار کے چہرے پر تاریکی کے باوجود سرپھری مسکراہٹ ابھری۔

"ویسے بھی میں کون سا ٹیم میں ہمیشہ رہتا ہوں؟ آؤٹ ہونا میرا روز کا کام ہے۔ آج ایک ایکسٹرا میچ سڑک اور ہی سہی!"

اس کے اس بے نیاز اور بے خوف جواب پر باقی لڑکوں کے منہ سے دبی دبی کھی کھی نکل گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں، دور سڑک پر گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی اندھیرے کو چیرتی ہوئی دکھائی دی۔ ایک سیاہ رنگ کی چمکتی ہوئی لگژری گاڑی زناٹے بھرتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

"لو جی... شکار آ گیا۔ یہ شاہ زیب کی ہی گاڑی ہے۔" زاویار کی آنکھوں میں خطر چمک ابھری۔ گاڑی سڑک کے بیچوں بیچ پڑی شاخ کے پاس آ کر ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ اندر سے شاہ زیب سلطان غصے سے بھرا ہوا باہر نکلا۔ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن درست کیے اور سامنے پڑی شاخ کو دیکھ کر گالی بکی۔ وہ خود شاخ ہٹانے کے لیے آگے بڑھا۔ ابھی اس نے شاخ کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ جھاڑیوں میں سے چاروں سرپھرے لڑکے ایک ساتھ باہر لپکے۔ شاہ زیب انہیں دیکھ کر گھبرا گیا لیکن اس نے خود پر قابو پاتے پوچھا۔

"کون ہو تم؟" جواب میں ایک ہاکی ہوا میں لہراتی ہوئی اس کے قریب سے گزری۔
"ہم تمہارے خیر خواہ ہیں۔ اور آج خیر لینے آئے ہیں۔"

شاہ زیب نے ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ "تمہیں اندازہ بھی ہے تم کس سے بات کر رہے ہو..."

شاہ زیب کی دھمکی ابھی آدھی ہی باہر نکلی تھی کہ زاویار نے بغیر ایک سیکنڈ ضائع کیے پہلی ہاکی کا بھرپور شاٹ شاہ زیب کی ٹانگ پر مارا۔ اس

کے بعد جو ہا کیوں کا آزادانہ اور تابڑ توڑ استعمال شروع ہوا...شاہ زیب سلطان کا تمام تر رعب، اس کا مہنگا سوٹ اور اس کا بناوٹی غرور لمحوں میں سڑک کی مٹی میں مل گیا۔ وہ شاہ زیب جو عدالتوں کے باہر میڈیا کے سامنے شیر بن کر اپنے بھائی کو بچانے کے لیے دھمکیاں دیتا تھا، اس وقت سڑک پر پڑا ہا کیوں سے بچنے کے لیے گیدڑ کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور دہائیاں دے رہا تھا۔

"آہ! اوئے کون ہو تم لوگ؟ کوئی ہے؟" شاہ زیب کی دردناک چیخیں ویران سڑک پر گونجنے لگیں۔ پانچ منٹ کی بھرپور اور تسلی بخش دھلائی کے بعد، شاہ زیب سڑک کے کنارے ادھ موا پڑا تھا۔ زاویار نے سکون سے اپنی ہا کی شانے پر رکھی، جھک کر شاہ زیب کی کوٹ کی جیب سے اس کا چمکتا ہوا آئی فون نکالا اور سوجے ہوئے شاہ زیب کے چہرے کے سامنے کر کے فوراً فیس آئی ڈی سے ان لاک کیا۔ پھر اس نے فون میں اس کے گھر کا یعنی سلطان احمد کا نمبر ڈائل کر کے سپیکر پر ڈال دیا۔ دوسری طرف سے چند بیلوں کے بعد سلطان احمد کی نیند میں ڈوبی مگر غصیلی آواز ابھری۔

"شاہ زیب؟ کہاں رہ گئے ہو تم اس وقت؟"

زاویار نے فون اپنے منہ کے قریب کیا، جبکہ نیچے پڑا شاہ زیب کراہ رہا تھا۔ اس کی مت ماری گئی تھی جو وہ آج اکیلا نکل آیا تھا اور زاویار کی پوری ٹیم کو کئی دنوں سے اسی انتظار تھا۔

"السلام علیکم انکل جی! میں شاہ زیب کے 'فین کلب' کا صدر بات کر رہا ہوں۔ آپ کا لاڈلا شہزادہ یہاں سڑک کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے۔ ہم نے اس کی تھوڑی ڈینٹنگ پینٹنگ اور سروس کر دی ہے۔ ذرا کسی کرین کو بھیج کر اپنا سامان اٹھوا لیں۔ او کے بائے!"

زاویار نے فون شاہ زیب کے سینے پر پٹخا، اپنے ساتھیوں کو سیٹی بجا کر اشارہ کیا، اور وہ چاروں تاریکی میں یوں غائب ہو گئے جیسے کبھی وہاں تھے ہی نہیں۔ پیچھے سڑک پر صرف شاہ زیب کی کراہیں اور فون پر سلطان احمد کی چیختی ہوئی آوازیں باقی رہ گئی تھیں۔ سقراط نے کچھ کیا تھا یا نہیں لیکن جذباتی زاویار نے اپنے کوچ کے حصے کا بدلہ لیا تھا۔

☆...☆...☆

اگلی صبح جب سورج کی پہلی کرنیں شبگیر ہاؤس کے صحن میں اتریں، تو گھر میں وہ پہلی والی چہچہاہٹ اور رونق نام کو نہ تھی۔ روشنی تو پھیل چکی

تھی،مگر ہر کونے پر اداسی کی ایک دبیز پرت جم چکی تھی۔مگر اس گھر کے افراد زندہ ہونے کی پھر سے کوشش کر رہے تھے۔ڈائننگ ٹیبل پر نوفہ اور تارہ اپنے سکول یونیفارم میں بیٹھی تھیں۔ان کا سامان پاس رکھا تھا اور ان کے چہروں پر غیر معمولی سنجیدگی تھی۔نامرہ، جو پہلے دیر تلک سوتی تھی،اب صبح جلدی اٹھنے لگی تھی۔سرمد صاحب بھی دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر آ چکے تھے اور دادی اپنی مخصوص جگہ پر آ بیٹھی تھیں۔گویا ڈائننگ ہال پھر سے روشن ہو گیا تھا۔کچن میں نیمل اور سلال موجود تھے۔سلال ہمیشہ سے ہی زہرہ بیگم کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا،نیمل نے شادی سے چند دن پہلے رات کے کھانے میں انکی مدد کی تھی اور آج نیمل ان کی جگہ کھڑی سب کے لیے ناشتہ بنا رہی تھی۔سلال نے ٹوسٹ اور دودھ کے گلاس ٹرے میں سلیقے سے رکھے اور باہر ڈائننگ ہال کی طرف لے آیا۔اس نے ہمیشہ کی طرح پیار سے وہ ٹرے تارہ اور نوفہ کے سامنے رکھی اور انہیں ناشتے کی تلقین کی۔کچن میں نیمل توے پر آملیٹ بنا رہی تھی۔

"ابو کا آملیٹ دھنیے والا ہوتا ہے..."سلال نے ایک پھیکی اور بوجھل مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔یہ سنتے ہی نیمل کا ہاتھ آملیٹ الٹتے ہوئے ساکت ہو گیا۔اس کی آنکھوں میں لرزش ابھری۔

"مُجھے...مُجھے یاد نہیں رہا۔"اس نے بالکل مدہم آواز میں کہا۔اس گھر میں ہر شخص کے آملیٹ کا ذائقہ الگ تھا۔کسی کو زیرے والا پسند تھا،کسی کو صرف کالی مرچ کا،اور سرمد صاحب بغیر دھنیے کے آملیٹ نہیں کھاتے تھے۔زہرہ بیگم کو ہر ایک کی پسند زبانی حفظ تھی اور وہ بنا کسی الجھن کے سب کا ناشتہ الگ انداز میں بناتی تھیں۔

" کوئی مسئلہ نہیں آپی، یہ میں کھا لوں گا..."سلال نے فوراً بات سنبھالی اور نرم مسکراہٹ کے ساتھ فریج کی طرف بڑھا اور وہاں سے دھنیا نکالا۔فریج کا دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر اندر پڑی تو اس نے ہلکی سی سانس بھری۔

"فریج میں کافی سامان خراب ہو گیا ہے۔ہمیں اس کی صفائی کرنی ہو گی..."

نیمل کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔اسے احساس ہوا کہ زہرہ بیگم کتنی خاموشی سے اس پورے گھر کے نظام کو سنبھالتی تھیں۔ہر چھوٹی چیز کا دھیان رکھنا،کسی سامان کو ضائع نہ ہونے دینا،سب کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا...ان کے بغیر ہر چھوٹا کام ایک بڑا پہاڑ لگ رہا تھا۔کچن میں کھڑے دونوں بہن بھائیوں کا رخ ایک دوسرے کی مخالف سمت میں تھا،مگر دونوں کی آنکھوں میں آنسوں تھے جنہیں وہ ایک دوسرے سے چھپا کر پی جانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

" کچن کی صفائی آج میں کرلوں گی۔" تبھی کچن کے دروازے پر نامرہ ابھری۔وہ سادہ سوٹ میں ملبوس تھی۔بال چھوٹی سی چٹیا میں باندھنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔دونوں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔یہ وہ نامرہ نہیں تھی۔بائیس سالوں میں کسی نے اسے اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔

"میری پہلی کلاس ویسے بھی گیارہ بجے ہوتی ہے۔"وہ اب سلال کے کپڑے نہیں پہنتی تھی۔اسکی جیکٹس ،اسکی شرٹس...اب وہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔

" کوئی ضرورت نہیں ہے۔میں نے پورے گھر کی صفائی کی زمہ داری حمیدہ کو دے دی ہے۔وہ نو بجے آجائے گی۔تم اپنی پڑھائی پہ دھیان دو۔"

نیمل نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔سلال اور نامرہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے تو پھر آپ کورٹ کب جارہی ہیں؟"نامرہ اب دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔بازو سینے پر باندھے اسکا انداز تفتیشی تھا۔

"جب میرا دل کیا میں چلی جاؤں گی۔"نیمل نے چائے تھرماس میں ڈالتے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جب میرا دل ہوگا میں کالج چلی...."

" بکواس بند کرو نامرہ...."اسکی بات پوری ہونے سے پہلے نیمل پھٹ پڑی۔کچھ میں سناٹا چھا گیا۔نامرہ کا چہرہ فق ہوا جبکہ سلال نے حیرت سے نیمل کو دیکھا۔نیمل نے ضبط سے آنکھیں میچ لیں۔

"جاؤ جا کر ناشتہ کرو۔مجھ سے بحث کوئی نہ کرے۔"اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہتے گھر کے تمام افراد کو گویا وارن کیا۔نامرہ حیرت اور صدمے کی سی کیفیت میں وہاں سے پلٹ گئی۔نیمل اب شیلف پہ دونوں ہاتھ جمائے خود پر ضبط کر رہی تھی۔اسکی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ سلال نے چائے کا تھرماس اٹھایا۔

" آپ بھی آجائیں ہم انتظار کر رہے ہیں۔"وہ نرم لہجے میں کہتا کچن سے نکل گیا۔نیمل وہیں کھڑی گہری سانسیں لے رہی تھی۔

چند لمحات بعد سب میز کے گرد موجود تھے۔ دادی، سرمد صاحب، نامرہ، تارہ اور نوفہ۔ پلیٹیں میز پر رکھی گئیں مگر کوئی بھی ہاتھ آگے بڑھانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ ہر شخص کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ اٹکا ہوا تھا اور لقمہ نگلنا دشوار تھا۔ سب اپنے اپنے جذبات پر ضبط کا بندھن باندھے، خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ٹوسٹ چبا رہے تھے۔ سب موجود تھے... مگر وہ ایک ہستی نہیں تھی جس سے یہ پورا گھر چمکتا تھا اور جس کی پکار پر یہ پورا خاندان ایک ساتھ مسکراتا تھا۔ نیمل نے خاموشی کو توڑنے کے لیے تارہ اور نوفہ کی طرف دیکھا۔

"تارہ... نوفہ... آج سے تم لوگوں کے پری بورڈ امتحانات شروع ہو رہے ہیں۔ ذرا دھیان سے پرچہ کرنا اور وقت کا خیال رکھنا۔" تارہ اور نوفہ نے چپ چاپ سر ہلایا۔
اسی اثنا میں سیڑھیوں سے قدموں کی آواز آئی اور سقراط تیار ہو کر نیچے اترا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات واضح تھے۔ نیمل نے جیسے ہی اسے دیکھا، وہ فوراً اپنی کرسی سے اٹھی۔

"میں ناشتہ نہیں کروں گا نیمل!"

سقراط کی مختصر، سپاٹ آواز گونجی اور نیمل کے اٹھے ہوئے قدم وہیں کے وہیں جم گئے۔

"مُجھے ذرا جلدی نکلنا ہے... میں کالج جا کر کچھ کھا لوں گا۔" سقراط نے سیڑھیوں کے آخری پائیدان سے ہی اپنا رخ باہر کے دروازے کی طرف موڑ لیا۔ دروازہ ایک لمحے کے لیے کھلا اور پھر ایک ہلکی سی دھپ کی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر ایک بار پھر سائیں سائیں کرتی خاموشی چھا گئی... ایک ایسی خاموشی جس میں ہر شخص سانس لینے سے بھی کتراتا تھا اور جسے کچھ ہی دیر بعد گلی میں آنے والی تارہ اور نوفہ کی سکول وین کے تیز ہارن نے توڑا۔ تارہ اور نوفہ نے خاموشی سے اپنے بیگز اٹھائے، دادی اور سرمد صاحب سے پیار لیا اور باہر کی طرف بڑھ گئیں۔ شبگیر ہاؤس کا ایک اور دن زہرہ بیگم کے بغیر شروع ہو چکا تھا... مگر اس کی ڈائننگ ٹیبل پر پھیلی اداسی بتاتی تھی کہ اب ناشتے کا ذائقہ کبھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

☆...☆...☆

سردیوں کی سختی آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی تھی اور میڈیکل کالج کے وسیع احاطے میں نئے موسم کی چاپ سنائی دینے لگی تھی۔ درختوں کی

شاخوں پر ننھی کونپلیں نمودار ہو رہی تھیں، لان میں کہیں کہیں نئے پھول کھل آئے تھے۔مگر سلال کے لیے موسم بدلنے سے کچھ نہیں بدلا تھا۔ وہ پندرہ دن بعد کالج آنا شروع ہو گیا تھا۔

ان پندرہ دنوں میں زندگی نے کسی کا انتظار نہیں کیا تھا۔کالج چل رہا، کلاسز دوبارہ شروع ہو چکی تھیں اور آخری سال کے طلبہ اپنی پڑھائی میں پہلے سے زیادہ مصروف ہو گئے تھے۔سلال بھی واپس آ چکا تھا مگر وہ پہلے والا سلال نہیں تھا۔کلاس روم میں آج کئی پروفیسرز نے اسے روک کر تعزیت کی تھی۔کچھ نے کندھے پر ہاتھ رکھا، کچھ نے صرف افسوس سے سر ہلایا اور چند نے اسے پڑھائی پر توجہ دینے کا مشورہ دیا۔وہ سب کی بات سنتا رہا۔صرف سنتا رہا۔نہ زیادہ جواب دیا، نہ کوئی سوال کیا۔

وہ پہلے ماحد کے ساتھ بیٹھ کر کلاس ختم ہونے سے پہلے ہی اگلی چھٹی کا منصوبہ بنانے لگتا تھا۔کسی نہ کسی بات پر ہنس دیتا، پروفیسر کی سختی کا مذاق اڑا دیتا یا ماحد کی کسی بے تکی حرکت پر پوری قطار میں ہنسی پھیلا دیتا۔اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جیسے بھول گئی تھی کہ اسے وہاں آنا بھی ہے۔عالیہ کی نگاہیں بار ہا غیر ارادی طور پر اس کی طرف اٹھتی رہی تھیں۔اسے دیکھ کر دل میں ایک عجیب سا خوف اٹھتا تھا۔سلال واپس آ گیا تھا۔اس کا مطلب تھا مقابلہ دوبارہ شروع ہو گا۔وہی کلاس، وہی رینکنگ، وہی امتحانات، وہی دوڑ۔اور اس دوڑ میں سلال اس سے ہمیشہ آگے رہتا تھا۔مگر اس خوف کے ساتھ ایک دوسرا احساس بھی تھا۔افسوس۔ایسا افسوس جس کے سامنے مقابلے کی خواہش بھی شرمندہ سی لگتی تھی۔وہ اپنی ماں کھو کر آیا تھا۔اور عالیہ، چاہ کر بھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔کلاس ختم ہوئی تو طلبہ ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔ماحد نے سلال کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"چل، کیفے ٹیریا؟"

"تم جاؤ میں آتا ہوں۔" وہ اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے بولا۔

"پکا؟"

سلال نے سر ہلا دیا۔تبھی ماحد کی نظر اس جانب آتی عالیہ پہ پڑی۔وہ بنا کچھ کہے پلٹ گیا۔عالیہ قریب آئی۔

"سلال۔"

سلال اپنے دھیان میں بیگ پیک کر رہا تھا اور پھر ٹھٹک گیا۔عالیہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔"

جواب مختصر تھا۔سلال نے ایک بار پلٹ کر اسے دیکھا،مگر صرف ایک لمحے کے لیے۔پھر نظریں ہٹالیں۔عالیہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل کو ذرا مضبوطی سے تھاما۔

"تمہاری پڑھائی کا کافی نقصان ہوا ہے۔"

"ہاں۔"

"میں نے..."

وہ ذرا جھجکی۔

"میں نے پچھلے پندرہ دنوں کے نوٹس بنا رکھے ہیں۔اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے سکتے ہو۔لیکچرز بھی ہیں،ریفرنسز بھی اور کچھ اہم ٹاپکس الگ سے مارک کیے ہیں۔"

سلال کی نظریں اسکے ہاتھوں میں دبی فائل پہ جا ٹھہریں۔وہ اسکے لیے ہی لائی تھی۔

"شکریہ۔"

پھر وہ ہلکا سا مسکرایا۔بہت ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ایسی جو ابھی پوری طرح اس کے چہرے تک پہنچی بھی نہیں تھی۔

"اس عنایت کے بدلے میں، مُجھے کیا دینا ہوگا؟"

عالیہ کا چہرہ ایک دم فق ہو گیا۔

" کچھ بھی نہیں۔"

سلال کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔"

"میں بھی نہیں۔" عالیہ نے فوراً کہا۔ "میں واقعی کسی بدلے کے لیے نہیں کر رہی۔"

سلال نے چند لمحے اسے دیکھا۔ پھر اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔

"دیکھو عالیہ..." وہ رک گیا۔ "تم جانتی ہو، ہم بہت اچھے کلاس فیلوز نہیں ہیں۔"

عالیہ خاموش رہی۔

"اور نہ ہماری رشتہ داری ایسی ہے کہ ہم کزن ہونے کے ناطے ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوں کہ تم میرے لیے اتنا کچھ کرو۔" اس کے لہجے میں الزام نہیں تھا۔ صرف صاف گوئی تھی جو شاید اس سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

"پھر تم کیوں میری مدد کرنا چاہتی ہو؟"

عالیہ نے نظریں جھکا لیں۔ اسکے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ اسکی آنکھوں کی جوت بجھ سی گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے خود کو سنبھالا۔

"ہاں میں سب جانتی ہوں لیکن...اب ہم دوست بن سکتے ہیں۔"

سلال کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت ابھری۔ پھر وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"میں عورتوں سے دوستی نہیں کرتا۔"

عالیہ نے فوراً سر اٹھایا۔ اسکے چہرے اور آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"کک...کیا مطلب؟"

"میری بہن کہتی ہے مردوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ غیر عورتوں سے دوستی کریں۔"

عالیہ چند لمحے فق چہرے سے اسے دیکھتی رہی پھر خود پر قابو پاتے گویا ہوئی۔

"تو تم ہر بات اپنی بہن کی مانتے ہو؟"

"ہر بات نہیں۔"

"یہ مانتے ہو؟"

"ہاں۔"

"اور اگر میں صرف ایک اچھی دوست بننا چاہوں؟"

سلال نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم میری کلاس فیلو ہو۔ میری کزن ہو۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔"

وہ ایک لمحے کو رکا۔

"لیکن میں تمہیں دوست نہیں بنا سکتا۔"

عالیہ کے ہونٹ ذرا سے کھلے، پھر بند ہو گئے۔

"تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟"

"بات اعتبار کی نہیں ہے۔"

"پھر؟"

"حدود کی ہے۔"

یہ ایک لفظ عالیہ کے اندر کہیں گہرا اتر گیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ چہرے پر الجھن تھی۔ وہ اب خود کو لعنت ملامت کر رہی تھی۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو اور میں چاہتا ہوں ہمارے بیچ یہ حد ہمیشہ قائم رہے۔"

سلال نے فائل کی طرف دیکھا۔ وہ اسے کسی قیمتی متاع کی طرح تھامے کھڑی تھی۔

"نوٹس دے دو۔ مُجھے ضرورت پڑے گی۔"

عالیہ نے فائل آگے بڑھادی۔اس نے لے لی۔

"شکریہ۔"

وہ مڑ گیا۔عالیہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔چند قدم کے بعد سلال نے رک کر پیچھے دیکھا۔

"اور عالیہ..."

وہ بے اختیار سیدھی ہوگئی۔

"اپنے نوٹس کے لیے کبھی مت سوچنا کہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔"

عالیہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"اور تم کبھی مت سوچنا کہ میں نے احسان کیا ہے۔"

سلال نے اس بار قدرے نرم نگاہوں سے اسے دیکھا۔پھر سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔
عالیہ وہیں کھڑی رہی۔زنیرہ کلاس سے باہر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی،سلال کے جاتے ہی وہ اندر بھاگی آئی۔

"واؤ اس نے تمہارے نوٹس لے لیے۔تم صحیح جا رہی ہو۔"

وہ چہکی۔عالیہ نے اپنی انگلیاں آپس میں پھنسالیں۔سلال کی آخری باتیں معمولی تھیں۔بالکل معمولی۔مگر کچھ لفظ معمولی ہو کر بھی دل میں جگہ بنا لیتے ہیں۔اور آج اس کے اندر کچھ چبھ گیا تھا۔ایسا کچھ...جسے وہ ابھی نام نہیں دے سکتی تھی۔

☆...☆...☆

سپورٹس کالج کا لنچ روم اس وقت طلبہ کی آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔شیشے کی بلند دیواروں سے ہلکی دھوپ اندر اتر رہی تھی اور دوسری جانب پھیلے وسیع گراؤنڈ میں ہاکی ٹیم کے چند کھلاڑی پریکٹس کر رہے تھے۔دور کہیں سیٹی کی آواز گونجتی، پھر لڑکوں کے شور میں دب جاتی۔ہاکی ٹورنامنٹس کا موسم قریب تھا،اس لیے کالج میں معمول سے کہیں زیادہ گہما گہمی تھی۔نامرہ آج اکیلی تھی۔آئمہ نہیں آئی تھی۔اس نے کیپ کے نیچے اپنے بال سمیٹ رکھے تھے۔جیکٹ اتار کر کمر پر باندھ رکھی تھی اور ٹرے ہاتھ میں لیے وہ کاؤنٹر کے سامنے کھڑی اپنی من پسند چیز اپنی ٹرے میں رکھ رہی تھی۔وہ ابھی پلیٹ اٹھا ہی رہی تھی کہ کسی کے قدم اس کے قریب آ کر رک گئے۔

"ہیلو۔"

نامرہ کے ہاتھ ایک لمحے کو رک گئے۔اس نے گردن موڑی۔ثالث بھی ٹرے اٹھائے کھڑا تھا۔کالے ٹریک سوٹ کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں اور بال معمول کے مطابق قدرے بکھرے ہوئے تھے۔وہ ابھی گراؤنڈ سے آیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟"

اس بار بھی جواب نہیں آیا۔ثالث نے اس کے چہرے کو چند لمحے دیکھا۔پھر جیسے کچھ طے کر لیا ہو، ہولے سے بولا۔

"کیا ہم لنچ ایک ساتھ کر سکتے ہیں؟"

نامرہ نے اسے دیکھا تک نہیں۔وہ ٹرے اٹھائے مڑ گئی اور کمرے کے نسبتاً خاموش حصے کی طرف چل دی۔ثالث اس کے پیچھے آ گیا۔گلاس وال کے قریب ایک خالی میز تھی۔اس کے دوسری جانب سے نیچے پورا ہاکی گراؤنڈ دکھائی دے رہا تھا۔دھوپ گھاس پر پھیلی تھی اور کھلاڑی تیزی سے گیند کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔نامرہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ثالث اس کے سامنے آ بیٹھا۔نامرہ نے ایسے کھانا شروع کر دیا جیسے سامنے کوئی بیٹھا ہی نہ ہو۔اس نے پہلے پانی کی بوتل کا ڈھکن کھولا، پھر پلیٹ میں موجود کھانے کو بے دلی سے چھیڑا۔ثالث اس کے اس رویے پر برا ماننے کے بجائے مسکرا دیا۔نامرہ نے فوراً بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"پھر ہنس کیوں رہے ہو؟"

"تمہیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے میں یہاں بیٹھا نہیں، کوئی جرم کر کے تمہارے سامنے سزا کاٹ رہا ہوں۔"

"تو اٹھ جاؤ۔"

ثالث نے بے فکری سے کندھے اچکائے۔"نہیں اٹھ سکتا۔"

نامرہ نے اسے چند لمحے گھورا، پھر دوبارہ کھانے لگی۔کچھ دیر دونوں کے درمیان صرف اردگرد کے شور کی آواز رہی۔پھر ثالث نے پیٹی کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں آنا چاہیے تھا۔"

نامرہ نے نوالہ روک کر اسے دیکھا۔

"میری پھوپھو اور تمہارے چاچو کے نکاح میں۔"

نامرہ کے ہاتھ میں پکڑا کانٹا ذرا سا رک گیا۔ثالث نے اپنی بات جاری رکھی۔

"بہت اچھا تھا۔مطلب...ہسپتال میں نکاح۔عجیب سا تھا، مگر اچھا بھی۔ایسا منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

نامرہ کے چہرے پر سختی آ گئی۔

"اس نکاح کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

ثالث نے اسے دیکھا۔"اچھا؟"

"وہ ایک ڈھونگ ہے۔"

"لیکن مُجھے ایسا نہیں لگا۔"

نامرہ نے نظریں اٹھائیں۔" کیوں؟"

" کیونکہ وہ دونوں خوش تھے۔"

اس کے لہجے میں عجیب سا یقین تھا۔

"اور زہرہ پھوپھو بھی خوش تھیں۔وہ مسکرا رہی تھیں۔تمہیں دیکھنا چاہیے تھا انہیں۔"

زہرہ پھوپھو؟ کتنے مان سے کہا گیا تھا۔یہ دو لفظ نامرہ کے اندر کہیں جا کر لگے۔اس نے نوالہ نگلنے کی کوشش کی،مگر وہ حلق میں اٹک گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بری طرح کھانسنے لگی۔ثالث فوراً سیدھا ہوا۔

"نامرہ!"

اس نے پانی کی بوتل اٹھائی اور اس کی طرف بڑھا دی۔

"یہ لو۔آہستہ۔"

نامرہ نے بوتل تقریباً جھپٹ لی اور غٹا غٹ پانی پینے لگی۔اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔وہ گلے پر ہاتھ پھیرتی رہی،سانس معمول پر لانے کی کوشش کرتی رہی۔ثالث کی مسکراہٹ کب کی غائب ہو چکی تھی۔وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اب ٹھیک ہو؟"

نامرہ نے جواب نہیں دیا۔چند لمحوں بعد اس نے بوتل میز پر رکھی اور سر اٹھایا۔آنکھیں سرخ تھیں۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

ثالث نے اپنی طرف انگلی کی۔

"میں؟"

"ہاں،تم۔"

وہ ذرا سا سیدھا ہو بیٹھا۔

"میں،ہمارے تعلقات درست کرنا چاہتا ہوں۔"

نامرہ کی آنکھوں میں تلخی اتر آئی۔

"تمہیں لگتا ہے دس سال کے بگڑے ہوئے تعلقات ایسے ٹھیک ہو جائیں گے؟"

"نہیں۔"

اس بار ثالث بھی سنجیدہ تھا۔

"لیکن کوشش تو کی جاسکتی ہے۔"

"میں ایسی کوئی کوشش نہیں کرنا چاہتی۔"

"لیکن میں کرنا چاہتا ہوں۔"

نامرہ خاموش رہی۔ثالث نے میز پر پڑی اپنی انگلیوں کو آپس میں جوڑا۔

"میں نہیں چاہتا کہ کل کو میری پھوپھو تمہارے گھر آئیں اور تم انہیں ذہنی اذیت دو۔"

نامرہ کا چہرہ جیسے پتھر کا ہو گیا۔

"وہ بہت کچھ کھو چکی ہیں۔کم از کم اپنے شوہر کے گھر میں انہیں یہ محسوس نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اکیلی ہیں۔"

نامرہ نے نظریں چرالیں۔اس کی آنکھوں میں اچانک جلن سی ہونے لگی۔اب بھی؟اب بھی اسے اپنے خاندان کی فکر تھی۔اپنی پھوپھو کی۔
نامرہ نے پلکیں زور سے جھپکیں اور اپنے اندر اٹھتی نمی کو واپس دھکیلنے کی کوشش کی۔

"تم کتنے خودغرض ہو۔"

ثالث کی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔وہ چند لمحے خاموش رہا۔پھر بہت دھیمے لہجے میں بولا۔

"تم سے کم ہوں، نامرہ۔"

نامرہ نے فوراً اسے دیکھا۔اس بار ثالث کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

"تم نے اپنی خودغرضی میں یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ نکاح تمہاری ماں کی آخری خواہش تھی۔"

نامرہ کے چہرے سے جیسے سارا خون کھنچ گیا۔وہ سفید پڑ گیا۔ثالث نے آواز مزید نرم کر لی۔

"تمہیں کم ازکم اس خواہش کا احترام کرنا چاہیے تھا۔"

نامرہ کے گلے میں آنسوؤں کا ایک سخت گولا آ کر پھنس گیا۔اس نے کچھ کہنا چاہا۔لب کھلے مگر آواز نہ نکلی۔اسے لگا جیسے ثالث نے اس کے سامنے وہ آئینہ رکھ دیا تھا جس سے وہ پچھلے کئی دنوں سے نظریں چرا رہی تھی۔زہرہ بیگم کی آخری خواہش۔
اور وہ...وہ اس خواہش کی تکمیل کے وقت ان کے ساتھ بھی نہیں تھی۔نامرہ نے نظریں جھکا لیں۔گلاس وال کے باہر کھلا آسمان تھا،گراؤنڈ میں لڑکے کھیل رہے تھے،سیٹی بج رہی تھی،زندگی اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔اور اس میز پر بیٹھی نامرہ کو محسوس ہوا کہ کچھ پچھتاوے انسان کے اندر شور نہیں کرتے۔وہ خاموشی سے اندر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر عمر بھر وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ نامرہ نے ٹرے کو میز پر سرکاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"مجھ سے دور رہا کرو،ثالث!"

"میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔"

وہ جو اٹھنے لگی تو ثالث کی آواز نے اسے روک دیا۔صرف ایک لمحے کے لیے وہ جیسے ساکت ہوئی تھی۔

"ہم سب کو آگے بڑھنے کی ضرورت ہے،نامرہ۔میں،تم...ہم سب۔ہمیں یہ دشمنی چھوڑ کر آگے بڑھ جانا چاہیے۔ہر وقت ماضی کو اپنے درمیان رکھ کر آخر کب تک جیتے رہیں گے؟"

نامرہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"چلو دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔"

"مرد کبھی دوست نہیں ہوتا۔" نامرہ نے تڑخ کر کہا۔ ثالث کی بھنویں سکڑ گئیں۔

"واٹ؟"

اس کے چہرے پر ایسی بے یقینی ابھری کہ نامرہ کو پہلی بار اس گفتگو میں کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔

"میری آپی کہتی ہیں، مرد دوست نہیں ہوتا۔"

اس بار ثالث بے ساختہ ہنس دیا۔ نامرہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تمہیں اس میں ہنسنے والی کیا بات لگی؟"

"کچھ نہیں۔" ثالث نے ہنسی دبانے کی کوشش کی، مگر ہونٹوں کے کنارے پھر بھی اٹھ گئے۔ "بس سوچ رہا ہوں تمہاری آپی نے مردوں کے بارے میں کتنی جامع تحقیق کر رکھی ہے۔"

"انہوں نے جتنا دیکھا ہے، اتنا کافی ہے۔"

ثالث کی مسکراہٹ ذرا مدھم ہوئی۔

"تو پھر کیا ہوتا ہے مرد؟"

"مرد باپ ہوتا ہے، بھائی ہوتا ہے، شوہر ہوتا ہے، بیٹا ہوتا ہے اور..."

نامرہ نے جیسے پہلے سے تیار جواب دیا۔ پھر وہ رک گئی۔

ثالث نے فوراً بھنویں اٹھائیں۔ "اور؟"

"اور باقی رشتے ہوتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"کزن وغیرہ۔"

"شکر ہے تمہاری آپی ڈکشنری میں کزن کا رشتہ موجود ہے۔" ثالث نے جیسے محظوظ ہوتے ہوئے سر ہلایا۔ نامرہ نے آنکھیں سکیڑیں۔

"وہ بھی صرف اس لیے کہ خاندان میں پیدا ہوتے وقت انتخاب کا اختیار نہیں ملتا۔"

ثالث کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ آئی۔

"اچھا! گر اختیار ملتا تو؟"

"تو شاید تمہیں بھی کسی اور میز پر بیٹھنے کا مشورہ دیتی۔"

"دیر سے سہی، مگر آج تم نے مُجھے کزن تو مانا۔ ترقی ہو رہی ہے۔"

نامرہ کا بس چلتا تو وہ ٹرے اٹھا کر ثالث کے سر پہ دے مارتی۔ شیشے کی دیوار کے باہر دھوپ کچھ اور ڈھل چکی تھی۔ وہ اسے یونہی تپانے والی

نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"مُجھے جانا ہے۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مڑی اور چند قدم چلی تو عقب سے ابھرنے والی ثالث کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ سنجیدہ تھی۔

"نامرہ۔"

وہ رک گئی، مگر پلٹی نہیں۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

چند لمحے کوئی آواز نہیں آئی۔ نامرہ نے آہستہ سے پلٹ کر اسے دیکھا۔ یہ وہ ثالث نہیں تھا جسے وہ پچھلے چار برسوں سے جانتی تھی۔ نہ وہ شوخ مسکراہٹ تھی، نہ چھیڑنے والا انداز، نہ بات کو مذاق میں اڑا دینے کی کوشش۔ صرف یقین تھا۔ جیسے اسے واقعی یقین ہو کہ ٹوٹے ہوئے رشتے دوبارہ جوڑے جا سکتے تھے۔ نامرہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بس اسے دیکھتی رہی، پھر تیز قدم اٹھاتی ہوئی لنچ روم سے باہر نکل گئی۔
ثالث وہیں بیٹھا رہا۔ اس کی نظریں اس دروازے پر جمی تھیں جس کے پیچھے نامرہ غائب ہو چکی تھی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے گہری سانس لی۔ زندگی کافی مشکل ہو چکی تھی۔

☆...☆...☆

یہ جرمنی کی ایک سرد شام تھی۔ شہر کی مرکزی سڑکوں سے ذرا ہٹ کر وہ بازار اپنی الگ ہی دنیا لگتا تھا۔ پرانی اینٹوں کی عمارتوں کے درمیان تنگ گلیاں، مدھم زرد بلب، دکانوں کے نیم بند شٹر اور ہوا میں گھلی سگریٹ اور کافی کی ملی جلی بو۔ یہاں وہ چیزیں بھی مل جاتی تھیں جنہیں شہر کے صاف ستھرے حصوں میں چھپ کر بھی جگہ نہیں ملتی تھی۔ دولڑکے اس گلی میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چل رہے تھے۔ حازق آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تو حق اس کا ہاتھ ذرا مضبوطی سے پکڑ لیتا۔ پھر خود اس کی رفتار کے مطابق قدم آہستہ کر دیتا۔ دونوں کے لباس نفیس تھے۔ حازق کے چہرے پر ہمیشہ رہنے والی معصوم سی کشادگی تھی جبکہ حق کی آنکھیں عمر سے کہیں زیادہ سنجیدہ دکھائی دیتی تھیں۔ ماتھے پر گرے

ہوئے بال بار بار ہوا سے اڑتے اور وہ انہیں جھٹک کر دوبارہ حازق کو دیکھنے لگتا۔

"تم شیور ہو نا، حازق؟"

حازق نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں۔"

"ابھی بھی؟"

"ہاں۔"

"دس منٹ بعد بھی؟"

"ہاں!"

حق نے اس کی طرف دیکھا۔

"اور جب سوئی چبھے گی؟"

حازق چند لمحے خاموش رہا۔

"تب بھی۔"

حق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"جھوٹ بول رہے ہو۔"

"میں نہیں ڈروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر اگر تم روئے تو میں تمہیں چڑاؤں گا۔"

حازق نے فوراً اس کا ہاتھ کھینچا۔

"تم نہیں چڑاؤ گے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم میرے بھائی ہو۔"

حق کی مسکراہٹ ایک لمحے کو ٹھہر گئی۔ پھر اس نے حازق کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھام لیا۔

"اسی لیے تو چڑاؤں گا۔"

حازق مسکرایا۔ "مُجھے twin ٹیٹو چاہیے۔"

"مُجھے پتا ہے۔"

"ہم دونوں بھائی بھائی ٹیٹو بنوائیں گے۔"

"ہاں، مگر ایک بات سن لو۔"

"کیا؟"

"اگر تم نے آخری وقت پر اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو میں اکیلا بنوالوں گا۔"

حازق نے رکتے ہوئے فوراً اپنا دوسرا ہاتھ بھی حق کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"نہیں! ساتھ بنوائیں گے۔"

حق نے ایک لمحہ اسے ٹھہر کر دیکھا۔ "چلو پھر۔"

وہ ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے رک گئے۔ دروازے کے اوپر کوئی واضح نام نہیں تھا۔ اندر مدھم روشنی تھی اور دیواروں پر مختلف ٹیٹو کے خاکے لگے ہوئے تھے۔ یہاں عمر پوچھنے کا رواج نہیں تھا، اجازت نامے دیکھنے کا بھی نہیں۔ بس پیسے اور مرضی کافی تھی۔ حق نے ایک لمحے کو اندر دیکھا۔ پھر حازق کو۔

"آخری موقع ہے۔ واپس جانا ہے؟"

حازق نے گردن نفی میں ہلا دی۔ "نہیں۔"

"پکا؟"

"پکا۔"

حق نے دروازہ کھول دیا۔ کچھ دیر بعد حازق ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی آستین اوپر کر دی گئی تھی اور کلائی میز پر رکھی تھی۔ ٹیٹو آرٹسٹ نے مشین تیار کی تو اس کی بھنبھناہٹ کمرے میں پھیل گئی۔ حازق کی آنکھیں فوراً پھیل گئیں۔ حق سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"یہ آواز بہت عجیب ہے۔"

"ٹیٹو بن رہا ہے، جہاز نہیں اڑ رہا۔"

حازق نے اسے گھورا۔

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

"میں نہیں ہنس رہا۔"

"تم ہنس رہے ہو۔"

"میں بس دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنے بہادر ہو۔"

حازق نے اپنے ہونٹ بھینچے اور بڑی سنجیدگی سے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

"شروع کرو۔"

پہلا لمس ہوا محسوس ہوا اور حازق کا پورا جسم ایک لمحے کو تن گیا۔اس نے فوراً حق کی طرف دیکھا۔حق نے کوئی مذاق نہیں کیا۔صرف اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔حازق نے اسے پکڑ لیا۔

"درد ہو رہا ہے؟"

"تھوڑا۔"

"رکوادوں؟"

حازق نے فوراً سر ہلا دیا۔

"نہیں۔"

پھر چند لمحوں بعد اس نے دانت بھینچ کر کہا۔

"لیکن اگر میں مر گیا تو دا جی کو تم بتانا کہ ٹیٹو تم نے بنوانا تھا۔"

حق پہلے حیران ہوا پھر ہنس دیا۔

"تمہیں قتل کرنے کا الزام بھی مجھ پر ڈال دو۔"

"ہاں۔"

"تمہیں پتا ہے نا تم بہت ڈرامہ کرتے ہو؟"

"میں ڈرامہ نہیں کرتا۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔" اس نے آنکھیں میچ لیں اور پھر ایک لمحے بعد اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔

" کتنا رہ گیا؟"

"ابھی کافی ہے۔"

حازق نے چھت کو دیکھا۔

"اوگاڈ..."

حق نے مسکراہٹ ضبط کرنے کے لیے ہونٹ بھینچ لیے۔ کچھ دیر بعد مشین رک گئی۔
حازق نے فوراً اپنی کلائی اٹھا کر دیکھی۔ وہاں ایک چھوٹا سا بھیڑیا تھا۔ منہ کھلا ہوا، گردن ذرا اوپر اٹھی ہوئی، جیسے وہ خاموش آسمان کی طرف دیکھ کر چیخ رہا ہو۔ حازق کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"یہ میں ہوں؟"

حق نے اس کی کلائی دیکھی۔

"نہیں۔ یہ بھیڑیا ہے۔"

"مذاق مت کرو۔"

"اچھا، تم ہو۔"

حازق نے خوش ہو کر اپنی کلائی گھمائی۔

"اب تمہاری باری۔"

حق کرسی پر بیٹھ گیا۔حازق اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم بھی بھیڑیا بنواؤ گے؟"

حق نے سر ہلایا۔

"نہیں۔"

" کیوں؟"

"میں بھیڑیا نہیں بنواؤں گا۔"

"تو کیا؟"

حق نے چند لمحے سوچا، پھر اپنی کلائی ٹیٹو آرٹسٹ کی طرف بڑھا دی۔

"ALPHA."

حازق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"جو حفاظت کرتا ہے۔"

"کس کی؟"

حق نے اس کی طرف دیکھا۔

"اپنے بھائی کی۔"

حازق کے چہرے پر آہستہ آہستہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تو میں بھیڑیا ہوں؟"

"ہاں۔"

"اور تم؟"

حق نے اپنی کلائی میز پر رکھ دی۔

"میں الفا ہوں۔"

حازق نے فخر سے سر ہلایا۔

"اچھا ہے۔ پھر مُجھے کوئی نہیں کھائے گا۔"

اس بار حق ہنس دیا۔

"کسی کو کوشش بھی نہیں کرنے دوں گا۔"

مشین دوبارہ چلنے لگی۔حازق نے حق کا کندھا پکڑ لیا۔

"درد ہو رہا ہے؟"

حق نے بے تاثری سے جواب دیا۔

"نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو..."

"جھوٹ نہیں بول رہا"

"تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں۔"

حق نے اسے دیکھا۔

"ابھی تمہیں میری آنکھوں سے زیادہ اپنی کلائی دیکھنی چاہیے۔"

"میرا ٹیٹو خوبصورت ہے۔"

"ہاں۔"

"تمہارا بھی ہوگا؟"

"ہو جائے گا۔"

اور کچھ دیر بعد اس کی کلائی پر بھی حروف ثبت ہو چکے تھے۔ ALPHA الفا۔
وہ دونوں جب دکان سے باہر نکلے تو سرد ہوا نے ان کے چہروں کو چھوا۔ حازق نے فوراً اپنی کلائی دیکھی، پھر حق کی۔

"ہم ایک جیسے نہیں ہیں۔"

"پتا ہے۔"

"میرا بھیڑیا ہے۔ تمہارا صرف لفظ۔"

"ہاں۔"

"ایسق کیوں؟"

حق نے چلتے چلتے اس کا ہاتھ دوبارہ تھام لیا۔

" کیونکہ بھیڑیا اکیلا بھی زندہ رہ سکتا ہے۔"

حازق نے اسے دیکھا۔"اور الفا؟"

حق نے اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں میں پیوست کر دیں۔

"الفا اکیلا نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ کوئی ہوتا ہے جس کی حفاظت اسے کرنی ہوتی ہے۔"

حازق کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اپنا سر اس کے بازو سے لگا دیا۔

"تو میں تمہارا وہ کوئی ہوں؟"

حق نے رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مگر بے حد گہری مسکراہٹ آئی۔

"تم ہمیشہ سے تھے۔"

☆...☆...☆

جرمنی میں بارش ہمیشہ شور کے ساتھ نہیں برستی تھی۔ کبھی کبھی وہ اتنی خاموشی سے گرتی تھی کہ سڑکوں پر پھیلی زرد روشنی، بھیگی ہوئی اینٹوں اور بند دکانوں کے شیشوں پر صرف اس کے قطرے دکھائی دیتے تھے۔ اس رات بھی بارش ایسی ہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت چھتری تھامے ایک تنگ گلی میں داخل ہوئی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چیز تھی، جسے اس نے سیاہ کپڑے میں بہت احتیاط سے لپیٹ رکھا تھا۔ وہ اسے کبھی سینے سے قریب کر لیتی، کبھی ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیتی، جیسے کپڑے کے اندر کوئی چیز نہیں بلکہ پانچ سال پرانا کوئی راز چھپا ہو۔ اس کا نام ونونا ولسن تھا۔ گلی کے آخری سرے پر ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ لکڑی کے پرانے دروازے کے اوپر دھندلے حروف میں لکھا تھا۔

TAROT

ونونا چند لمحے دروازے کے سامنے کھڑی رہی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔ اندر باہر کی دنیا سے بالکل مختلف خاموشی تھی۔ مدھم روشنی، لکڑی کی پرانی میز، دیواروں پر عجیب و غریب علامتیں اور جلتی ہوئی موم بتیوں کی ہلکی سی بو۔ باہر بارش مسلسل شیشے پر دستک دے رہی تھی۔

"آیئے۔"

سامنے بیٹھی عورت نے صرف اتنا کہا۔ونونا نے چھتری بند کی، اسے دروازے کے ساتھ رکھا اور آہستہ آہستہ میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے وہ کچھ بول نہ سکی۔اس کی انگلیاں سیاہ کپڑے کے کنارے سے الجھ رہی تھیں۔

"آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟" سوال سادہ تھا۔ونونا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"میں اپنی بیٹی کے لیے آئی ہوں۔"

سامنے بیٹھی عورت خاموش رہی۔ونونا نے کپڑے میں لپٹی چیز کو میز پر رکھا۔

"پانچ سال پہلے وہ مرگئی تھی۔"

اس کا گلا بھرایا۔

"پولیس نے کہا خودکشی تھی۔انہوں نے کہا کہ میری بیٹی نے اپنی گاڑی دریا میں اتاری اور اپنی جان لے لی۔"

وہ کچھ لمحے خاموش رہی۔

"لیکن میری بیٹی ایسی نہیں تھی۔"

اس بار اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

"وہ زندگی سے محبت کرتی تھی۔اتنی کہ کبھی کبھی مُجھے اس کی زندگی سے محبت پر رشک ہوتا تھا۔"

اس نے آنکھیں پونچھیں۔

"میں پولیس کے پاس گئی۔ بار بار گئی۔ میں نے کہا کہ کچھ غلط ہے۔ کسی نے میری نہیں سنی۔ پانچ سال ہو گئے ہیں۔"

اس کی نگاہ میز پر پڑی چیز پر ٹھہر گئی۔

"میں بس یہ جاننا چاہتی ہوں..."

اس نے کپڑے پر ہاتھ رکھا۔

" کیا میری بیٹی نے واقعی خودکشی کی تھی؟ میں پانچ سال سے تڑپ رہی ہوں۔ میری مدد کر دیں، پلیز۔"

سامنے بیٹھی عورت نے کچھ دیر اسے دیکھا۔

پھر اس کی نظر سیاہ کپڑے میں لپٹی چیز پر گئی۔

"یہ کیا ہے؟"

ونونا نے کپڑا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر پھر رک گئی۔

"یہ میری بیٹی کی چیز ہے۔ اس کے مرنے کے بعد مُجھے ملی تھی۔"

" آپ اسے یہاں کیوں لائی ہیں؟"

"مُجھے نہیں معلوم۔" وہ بے بس ہو کر مسکرائی۔ "بس... مُجھے لگا شاید یہ کچھ بتا سکے۔"

اس نے کپڑا کھول دیا۔ میز پر ایک چھوٹا سا شیشے کا گلوب رکھا تھا۔ باہر سے دیکھنے پر وہ بالکل عام سا کرسمس گلوب تھا۔ شفاف شیشے کے اندر

سفید برف جمی ہوئی تھی اور درمیان میں سرخ لباس پہنے ایک ننھا سا سینٹا کلاز کھڑا تھا۔ نیچے مصنوعی برف کی تہہ تھی، جبکہ گلوب کو ہلانے پر ننھے ننھے سفید ذرات اندر گھومنے لگتے تھے۔ ٹیروٹ ریڈر نے اسے دیکھا۔ پھر اپنی انگلیاں کارڈز کے ڈھیر پر پھیرتے ہوئے ایک کارڈ نکالا۔

کارڈ میز پر الٹا رکھا گیا۔ ونونا نے اسے پلٹنے کی کوشش کی، مگر عورت نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"پہلے آنکھیں بند کریں۔"

ونونا نے آنکھیں بند کر لیں۔

"اور گلوب کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیں۔"

اس نے ویسا ہی کیا۔ ٹھنڈا شیشہ اس کی ہتھیلیوں کے درمیان تھا۔

"اپنی بیٹی کے بارے میں سوچیں۔"

ونونا کے ہونٹ کانپے۔ "میں ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتی ہوں۔"

"اس رات کے بارے میں سوچیں۔"

ونونا کی سانس بھاری ہوگئی۔

"وہ رات..." اس نے گلوب کو مزید مضبوطی سے تھام لیا۔

"اب اسے ہلائیں۔"

اس نے گلوب ہلایا۔شیشے کے اندر برف کے ننھے ذرات اٹھے اور سینٹا کلاز کے گرد گھومنے لگے۔سینٹا کلاز ہلنے لگا اور گول سے آواز ابھرنے لگی۔ایک ٹیون تھی جو بج رہی تھی۔

Ding, dong, ding, dong, ding

Ding, dong, ding, dong, ding

Ding, dong, ding, dong, ding

یہ مشہور گانا carol of the bells کا میوزک تھا جو عموماً ایسے کرسمس گلوبز میں پایا جاتا تھا۔ونونا کی بند آنکھوں کے پیچھے جیسے کوئی دروازہ کھل گیا۔پہلے پانی۔بہت سا پانی۔پھر ایک گاڑی۔اندھیرا۔بارش۔اور پھر...ایک ہاتھ۔ونونا کی انگلیاں اچانک سخت ہوگئیں۔اس ہاتھ کی کلائی پر کچھ بنا ہوا تھا۔وہ نشان واضح نہیں تھا۔پھر جیسے کسی نے تصویر کو قریب کر دیا ہو۔کلائی۔جلد۔اور اس پر بنا ہوا...بھیڑیا۔ایک بھیڑیا،جس کا منہ کھلا ہوا تھا اور سر آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ونونا نے ایک جھٹکے سے گلوب چھوڑ دیا۔گلوب کے میز پر گرنے کی آواز ابھری۔وہ کرسی سے پیچھے ہٹ گئی۔اس کی آنکھیں خوف سے پھیل چکی تھیں۔

"کیا دیکھا آپ نے؟"

ٹیروٹ ریڈر نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ونونا ہانپ رہی تھی۔اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں میز پر رکھ دیں۔

"ب...بھیڑیا..."اس کی آواز بمشکل نکلی۔

"کیا؟"

"بھیڑیا ہے وہ۔"اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"میں نے دیکھا ہے۔"

"کہاں؟"

ونونا نے کانپتے ہاتھ سے اپنی کلائی کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کے ہاتھ پر۔"

ٹیروٹ ریڈر کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

"آپ کو یقین ہے؟"

"ہاں!"

ونونا تقریباً چیخ پڑی۔

"وہاں ایک بھیڑیا بنا تھا۔ بالکل واضح۔"

اس نے گلوب کو دیکھا۔

"میری بیٹی نے خودکشی نہیں کی۔" اس بار اس کی آواز میں خوف کم اور یقین زیادہ تھا۔ "کسی نے اسے مارا تھا۔"

ٹیروٹ ریڈر نے گہرا سانس لیتے ہوئے الٹا رکھا کارڈ اٹھایا اور اسے پلٹ دیا۔ کارڈ پر بھیڑیا بنا تھا۔ ونونا کی سانس رک گئی۔ اس نے کارڈ دیکھا۔ پھر اپنے سامنے رکھے گلوب کو۔ پھر دوبارہ کارڈ کو۔

"یہ..." اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ "یہ کیا ہے؟"

ٹیروٹ ریڈر نے کارڈ واپس میز پر رکھ دیا۔

"میں مستقبل نہیں بتا رہی، مسز ولسن۔ میں صرف وہ دیکھ رہی ہوں جو آپ اپنے ساتھ یہاں لے کر آئی ہیں۔"

"تو پھر یہ نشان کیا ہے؟"

" کسی شخص کی شناخت بھی ہو سکتی ہے۔"

" کون؟"

ٹیروٹ ریڈر خاموشی۔

" کیا وہ زندہ ہے؟"

ٹیروٹ ریڈر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ونونا کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مُجھے پولیس کے پاس جانا ہوگا۔"

اس نے گلوب دوبارہ کپڑے میں لپیٹا۔ اس بار اس کے ہاتھ پہلے کی طرح نہیں کانپ رہے تھے۔ پانچ سال بعد پہلی مرتبہ اسے اپنی بیٹی کی موت کے پیچھے کوئی نشان ملا تھا۔ ایک چھوٹا سا نشان۔ ایک بھیڑیا۔ اور کبھی کبھی انصاف تک پہنچنے کے لیے پوری کہانی نہیں، صرف ایک نشان کافی ہوتا ہے۔

☆...☆...☆

بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ ایک نسبتاً خاموش پولیس اسٹیشن کی شیشے کی کھڑکیوں پر پانی کی بوندیں مسلسل پھسل رہی تھیں۔ اندر معمول کے

مطابق فون کی گھنٹیاں، کی بورڈ پر چلتی انگلیاں اور کبھی کبھار بجنے والے ریڈیو کی آوازیں فضا میں گھلی ہوئی تھیں۔ دروازہ کھلا اور ونونا ولسن اندر داخل ہوئی۔ اس کے بال بارش سے بھیگے ہوئے تھے۔ چھتری ہاتھ میں تھی اور سیاہ کپڑے میں لپٹا ہوا وہ چھوٹا سا گلوب اس نے سینے سے لگا رکھا تھا۔ ریسپشن پر بیٹھے افسر نے اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے پہچان کا تاثر آیا۔

"مسز ولسن..."

ونونا تیزی سے کاؤنٹر تک پہنچی۔

"مُجھے اپنی بیٹی کے کیس کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

افسر نے گہری سانس لی۔

"ہم اس بارے میں پہلے بھی بات کر چکے ہیں۔"

"نہیں۔ اس بار میرے پاس ثبوت ہے۔"

قریب بیٹھے ایک دوسرے افسر نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ ونونا نے کپڑا کھولا اور گلوب کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"اس نے خودکشی نہیں کی تھی۔ اسے قتل کیا گیا تھا۔"

"مسز ولسن..."

"میں جانتی ہوں آپ لوگ کیا سوچتے ہیں۔" اس کی آواز میں تلخی بھر آئی۔ "آپ سب سمجھتے ہیں میں پاگل ہوگئی ہوں۔ پانچ سال سے یہی سمجھ رہے ہیں نا؟"

کوئی جواب نہیں آیا۔

"لیکن میں پاگل نہیں ہوں۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔"

"کسے؟"

"قاتل کو۔"

اب دو افسر باقاعدہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ونونا نے کانپتی انگلیاں اٹھائیں۔

"اس کے ہاتھ پر بھیڑیا بنا ہوا تھا۔"

ایک افسر نے بے اختیار نظریں چرا لیں۔

"آپ نے قاتل کا چہرہ دیکھا؟"

"نہیں۔"

"قد؟ عمر؟ لباس؟"

"نہیں۔"

"تو آپ نے صرف ایک ٹیٹو دیکھا؟"

ونونا کی آنکھیں بھر آئیں۔ "ہاں۔"

افسر نے ہلکی سی بے بسی سے سر ہلایا۔

"مسز ولسن، یہ کوئی قابلِ تصدیق شناخت نہیں ہے۔"

"لیکن میری بیٹی خودکشی نہیں کرسکتی تھی۔" اس کی آواز پورے ہال میں گونج گئی۔ "میں اس کی ماں ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ کیسی تھی۔"

کچھ لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر ونونا نے گلوب کو دوبارہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"مُجھے نہیں معلوم یہ کیا ہے۔ مُجھے نہیں معلوم میں نے جو دیکھا وہ کیسے دیکھا۔ لیکن میں جانتی ہوں..."

اس نے اپنی نم آنکھیں سامنے بیٹھے افسر پر گاڑ دیں۔

"اسے بھیڑیے نے مارا ہے۔"

اسی لمحے داخلی دروازے سے ایک خاتون افسر باہر آئی۔ وہ کچھ فاصلے پر رک کر ونونا کی بات سن رہی تھی۔ عمر چالیس کے لگ بھگ، بال سختی سے بندھے ہوئے، ہاتھ میں فائلوں کا ایک فولڈر تھا۔ اس نے باقی افسران کی طرح ونونا کو ترحم سے نہیں دیکھا۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ نے یہ بھیڑیا کہاں دیکھا؟"

ونونا نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔

"قا..قاتل...کی کلائی پر۔"

"آپ نے حقیقت میں دیکھا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر؟"

ونونا نے چند لمحے توقف کیا۔

"میں ایک ٹیروٹ ریڈر کے پاس گئی تھی۔"

کمرے میں ایک دولوگوں کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ آئی۔خاتون افسر نے کسی کونہیں دیکھا۔اس کی نظریں صرف ونونا پر تھیں۔

"اور وہاں آپ نے یہ بھیڑیا دیکھا؟"

"ہاں۔"

"کیا آپ پہلے سے جانتی تھیں کہ اس شخص کے ہاتھ پر کوئی نشان تھا؟"

ونونا نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔"

خاتون افسر نے گلوب کی طرف دیکھا۔

"یہ آپ کی بیٹی کا تھا؟"

"ہاں۔"

" کیا یہ اس کی گاڑی سے ملا تھا؟"

ونونا رک گئی۔

"ہاں۔اس کی چیزوں میں تھا۔"

خاتون افسر نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔"

ونونا کی آنکھوں میں امید کی ایک معمولی سی روشنی ابھری۔

" آپ میری بات مانتی ہیں؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی کہ آپ کی بات درست ہے۔" خاتون افسر نے نہایت پرسکون لہجے میں کہا۔ "میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ میں آپ کی بات سن رہی ہوں۔"

ونونا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"بس یہی چاہیے تھا مُجھے ... پانچ سال سے کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں تھا۔"

خاتون افسر نے گلوب اس سے لے لیا۔

"آپ گھر جائیں۔"

"لیکن..."

"اگر آپ کو کچھ اور یاد آئے، کوئی معمولی سی بات بھی، تو مُجھے بتایئے گا۔"

ونونا نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مڑی، چند قدم چلی، پھر واپس پلٹی۔

"افسر؟ میری بیٹی کا نام میری ولسن تھا۔"

خاتون افسر نے نام ذہن میں دہرایا۔

"میری ولسن۔"

"پانچ سال پہلے اس کی فائل بند ہوئی تھی۔"

"مُجھے معلوم ہے۔"

ونونا کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"آپ کو معلوم ہے؟"

"اب معلوم ہوا ہے۔"

ونونا نے اسے چند لمحے دیکھا، پھر خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ بند ہوا تو کمرے میں دوبارہ وہی معمول کا شور لوٹ آیا۔ خاتون افسر وہیں کھڑی رہی۔ پھر اس نے اپنے جونیئر کی طرف دیکھا۔

"میری ولسن کی فائل لے کر آؤ۔"

جونیئر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میڈم؟"

"ابھی۔"

"لیکن وہ کیس تو پانچ سال پہلے بند ہو چکا ہے۔"

"اسی لیے تو دیکھنا ہے کہ اسے بند کیوں کیا گیا تھا۔"

جونیئر نے اثبات میں سر ہلایا اور فائل روم کی طرف بڑھ گیا۔ خاتون افسر اپنی میز پر واپس آئی۔ اس نے کمپیوٹر کھولا۔ اسکرین پر خالی سرچ بار چمک رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ ٹائپ کیا۔ MERY WILSON۔ چند سیکنڈ بعد اسکرین پر ایک پرانی کیس فائل نمودار ہوئی۔ وہ آگے جھکی۔ فائل کھلنے سے پہلے ہی اس کی نظر ایک چیز پر رک گئی۔

Cause of death: Suicide.

اس نے چند لمحے اس لفظ کو دیکھا۔ پھر ونونا کی آواز جیسے دوبارہ اس کے کانوں میں گونجی۔

"میری بیٹی خودکشی نہیں کر سکتی تھی۔"

خاتون افسر نے اسکرین پر موجود فائل کو کھولا۔

"دیکھتے ہیں، مسز ولسن..."

اس کی انگلی ماؤس پر رک گئی۔

"پانچ سال پہلے اصل میں ہوا کیا تھا۔"

☆...☆...☆

شام آہستہ آہستہ شہر پر اتر رہی تھی۔ سورج کی آخری روشنی عمارتوں کے شیشوں پر ٹھہری ہوئی تھی اور سڑکوں پر گاڑیوں کی روشنیاں ایک ایک کر کے جلنے لگی تھیں۔ نجف کئی گھنٹوں سے بے مقصد گاڑی چلا رہی تھی۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی تھی۔ بس گاڑی چل رہی تھی اور وہ اسٹیئرنگ تھامے سامنے پھیلی سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال گردن کے پیچھے ڈھیلے سے بندھے ہوئے تھے اور ہلکے رنگ کے اسکارف نے اس کی گردن کو ڈھانپ رکھا تھا۔ چہرے پر معمول کی شادابی نہیں تھی۔ آنکھوں کے نیچے ہلکے سائے تھے اور وہ کئی گھنٹوں سے نہ سوئی ہوئی عورت کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ تھک چکی تھی۔ بہت زیادہ۔ اکتیس سال پہلے کے ریکارڈ اس نے ایک ایک کر کے دیکھے تھے۔ اپنی پیدائش کا ریکارڈ۔ نشاط کی پیدائش کا ریکارڈ۔ ہسپتال کی فائلیں۔ لیب رپورٹس۔ ویکسینیشن کارڈز۔ پیدائش کے وقت کے تمام طبی مشاہدات۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی غیر معمولی نہیں۔ وہ اور نشاط جڑواں پیدا ہوئی تھیں۔ دونوں صحت مند تھیں۔ دونوں کا وزن معمول کے مطابق تھا۔ کوئی اضافی ٹیسٹ نہیں، کوئی تجربہ نہیں، کوئی ایسی دوا نہیں جس کا ریکارڈ موجود نہ ہو۔

تو پھر یہ سب کیا تھا؟ اگر اس کے ساتھ واقعی کوئی تجربہ ہوا تھا تو وہ کیا تھا؟ کس نے کیا تھا؟ اور سب سے بڑھ کر... کیوں؟ نجف نے اسٹیئرنگ پر گرفت مضبوط کر لی۔ اسے ایک ایک کر کے یاد آیا، اس نے آج کتنی بار مختلف چیزوں کو چھونے کی کوشش کی تھی۔ ایک کیفے میں کسی کے اٹھ کر جانے کے بعد وہ اسی کرسی پر بیٹھی تھی۔ کچھ دیر آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی تھی۔ کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ ایک دکان میں اس نے دروازے کا ہینڈل چھوا تھا۔ کچھ نہیں ہوا۔ سڑک کنارے ایک بینچ پر ہاتھ رکھا تھا۔ سب نارمل رہا۔ گاڑی میں واپس آ کر اس نے اپنے فون کو چھوا تھا۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ صرف ایک چیز تھی جو اسے ڈرا دیتی تھی۔ انسان... انسان کو چھوتے ہی کبھی کبھی دنیا بدل جاتی تھی۔ ایک اندھیرا۔ ایک حادثہ۔ ایک موت۔ اور پھر وہ واپس اسی دنیا میں پھینک دی جاتی تھی جہاں باقی سب لوگ بالکل معمول کے مطابق سانس لے رہے ہوتے

تھے۔وہ خود بھی ڈاکٹر تھی۔اسے معلوم تھا دماغ خوف کے زیرِ اثر کتنی عجیب چیزیں دکھا سکتا ہے۔لیکن ہر بار ایک ہی طرح کا اندھیرا؟ایک ہی طرح کا احساس؟اوراب زہرہ آپا کی موت...نجف نے بے اختیار اپنی انگلیاں اسٹیئرنگ سے ہٹالیں۔زہرہ آپا کا ہاتھ یاد آیا۔اس نے فوراً آنکھیں بند کر کے سر سیٹ سے ٹکا دیا۔

"نہیں..."

سرگوشی اتنی دھیمی تھی کہ شاید خود اس کے کانوں تک بھی پوری نہ پہنچی۔اسی وقت فون اسکرین روشن ہوئی۔نجف نے کئی لمحے اسے دیکھا۔فون صبح سے بند تھا۔جیسے اس نے دنیا سے اپنا رابطہ ہی توڑ دیا ہو۔ابھی آن کیا تھا۔اسکرین پر ایک کے بعد ایک نوٹیفکیشن ابھرنے لگے۔سارہ کی کالز تھیں۔بارہ مسڈ کالز۔پھر پیغامات۔

"تم نے شادی کر لی؟"

نجف کی انگلی رک گئی۔اگلا پیغام۔

"تم نے سقراط شبگیر سے شادی کر لی؟"

اس نے پلکیں جھپکیں۔تیسرا پیغام۔

"نجف؟کیا یہ خبر سچ ہے؟اوہ مائی گاڈ!تم ایسے کیسے کر سکتی ہو؟"

نجف کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ آئی۔"کیسے؟"یہ سوال تو وہ خود سے بھی کئی بار پوچھ چکی تھی۔فون دوبارہ بج اٹھا۔اسکرین پر سارہ کا نام تھا۔نجف نے چند لمحے اسے بجنے دیا،پھر کال اٹھالی۔

"ہیلو۔"

دوسری طرف چند لمحوں تک صرف خاموشی رہی۔ پھر سارہ تقریباً چیخ ہی پڑی۔

"تم زندہ ہو؟"

نجف نے آنکھیں بند کر لیں۔ "ہاں۔"

"ہاں؟ بس ہاں؟ میں تمہیں کل سے کال کر رہی ہوں۔ تمہارا فون بند تھا، واٹس ایپ پر جواب نہیں، ہسپتال میں پوچھا تو کسی نے ٹھیک سے بتایا نہیں، اور پھر آج صبح مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا نکاح ہو گیا ہے۔"

نجف خاموش رہی۔

"اور وہ بھی کس سے؟"

نجف نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ "سقراط شبگیر سے۔"

"مُجھے معلوم ہے کس سے!" سارہ کی آواز میں بے یقینی تھی۔ "میں تم سے پوچھ رہی ہوں کیسے؟"

نجف نے لب بھینچ لیے۔ "زہرہ آپا کی خواہش تھی۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

"انہوں نے چاہا تھا کہ میرا اور سقراط کا نکاح ہو۔"

"لیکن نجف، تم دونوں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتے۔ تم نے خود مُجھے کتنی بار بتایا ہے کہ وہ تمہیں دیکھنا تک پسند نہیں کرتا اور تم..."

"یہ شادی میری خواہش نہیں تھی۔"

اس بار نجف کی آواز میں تھکن تھی۔

"نجف..." سارہ کی آواز دھیمی تھی۔نجف کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"وہ نہیں رہیں، سارہ۔"

سارہ جیسے سمجھ ہی نہ پائی۔"کیا؟"

"زہرہ آپا نہیں رہیں۔"

اس بار خاموشی صرف چند لمحوں کی نہیں تھی۔وہ لمبی ہوتی گئی۔نجف کی دبی ہوئی سسکی سنائی دی۔

"اوہ خدایا..."

نجف نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔

"مُجھے نہیں معلوم تھا..." سارہ کو افسوس ہوا۔

نجف نے سامنے دیکھا۔سڑک پر گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ہر شخص اپنی زندگی میں مصروف تھا۔جیسے دنیا میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"ان کی ہارٹ سرجری تھی۔"اس کی آواز بھرا گئی۔

"پھر؟" سارہ نے گہری سانس لی۔

"پھر وہ آپریشن تھیٹر کے اندر چلی گئیں۔" نجف نے نگاہیں جھکا لیں۔
"اور باہر نہیں آئیں۔"

سارہ نے بہت آہستہ سے کہا، "نجف... مُجھے بہت افسوس ہے۔"

نجف نے جواب نہیں دیا۔ کچھ لمحوں بعد سارہ نے خاموشی توڑی۔

"اور تم؟ تم ٹھیک ہو؟"

نجف کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ ابھری۔ "یہ سوال اب بہت عجیب لگتا ہے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ مُجھے خود نہیں معلوم میں ٹھیک ہوں یا نہیں۔"

اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

"سارہ، میرے ساتھ کچھ ہو رہا ہے۔"

سارہ فوراً سنجیدہ ہوگئی۔ "کیا ہو رہا ہے؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں طبیعت ٹھیک ہے۔"

"تم نے کسی کو بتایا؟"

"کسے؟"

"کسی ڈاکٹر کو؟"

نجف نے ہولے سے مسکرائی۔

"میں خود ڈاکٹر ہوں۔"

"تو خود کو مریض سمجھ کر سوچو۔"

نجف خاموش ہوگئی۔سارہ کی آواز مزید نرم ہوئی۔

"جو کچھ تم محسوس کر رہی ہو اسے نظر انداز مت کرنا۔چاہے وہ نفسیاتی ہو، neurological ہو یا کچھ اور۔"

"میں نے اکتیس سال پرانا اپنا پورا ریکارڈ دیکھ لیا ہے۔"

"اور؟" سارہ بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی آخر نجف کیا محسوس کر رہی تھی۔

"کچھ نہیں ملا...کچھ بھی نہیں۔" نجف نے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔

"تم کیا ڈھونڈ رہی ہو نجف؟"

"میں خود نہیں جانتی۔میں اور نشاط بالکل نارمل تھیں۔"

"نجف...تم اکیلی مت رہنا۔" سارہ نے جیسے التجا کی۔ "تم ابھی کہاں ہو؟ میں آجاتی ہوں۔رات تمہارے پاس رک جاؤں گی۔"

نجف نے رخ موڑ کر دیکھا۔وہ شہر سے کافی دور آ گئی تھی۔بہت دور...

"مُجھے گھر پہنچتے رات ہو جائے گی۔ہم کسی اور دن ملتے ہیں۔" نجف نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔سارہ نے گہری سانس لی۔

"تمہاری زندگی میں اچانک بہت کچھ ہو گیا ہے۔شادی، زہرہ آپا کی موت...تمہیں کسی اپنے کے پاس ہونا چاہیے۔"

نجف نے کچھ دیر سوچا۔"میرے پاس کوئی اپنا نہیں ہے، سارہ۔"

یہ جملہ کہتے ہوئے اس کی آواز بالکل رندھ گئی۔ایک دم سے سب کچھ اجنبی لگنے لگا تھا جیسے وہ اس دنیا میں اکیلی عورت ہو۔سارہ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔وہ خود صدمے کی سی کیفیت میں تھی۔نجف نے چند لمحوں کے لیے خاموش رہ کر سامنے دیکھا۔پھر گاڑی کا رخ موڑ دیا۔

"نجف..." سارہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"مُجھے کچھ جواب چاہییں سارہ۔" اس نے فون کان سے ذرا دور کیا۔

"اور اس بار میں کسی سے خوابوں، یادوں یا اتفاقات کے بارے میں نہیں پوچھوں گی۔" اس کی آنکھوں میں سختی در آئی تھی۔

"میں اپنے خاندان سے پوچھوں گی۔"

اس نے فون کاٹ دیا۔کال ختم ہو گئی۔اس نے فون آہستہ سے ساتھ والی نشست پر رکھ دیا۔گاڑی اب شہر کی دوسری سمت بڑھ رہی تھی۔ بزدار پیلس کی طرف۔ بعض سوالات کے جواب انسان جتنا دیر سے تلاش کرے، ان کے پیچھے چھپی حقیقت اتنی ہی خوفناک ہوتی جاتی ہے۔

☆...☆...☆

صبح پوری طرح جاگ کی تھی جب قادری اسپورٹس کالج کا ہاکی گراؤنڈ شور سے بھرنے لگا۔ٹھنڈی ہوا میں گھاس پر جمی اوس اب بھی چمک رہی تھی مگر گراؤنڈ کے ایک کونے میں کھڑی پوری ٹیم کے چہروں پر صبح کی تازگی نام کو نہیں تھی۔سب سر جھکائے کھڑے تھے۔کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ دوسرے کی طرف دیکھ لے۔

سقراط ان کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ٹریننگ کِٹ میں، ہاتھ میں موبائل لیے، چہرے پر غیر معمولی طور پر سنجیدگی تھی۔اس نے موبائل کی اسکرین روشن کی۔اسکرین پر شاہ زیب کی تصویر تھی۔گھٹنا پٹیوں میں بندھا ہوا، ایک آنکھ کے گرد نیلا پڑا ہوا گوشت اور پیشانی پر سفید پٹی۔سقراط نے چند لمحے تصویر کو دیکھا۔پھر موبائل لاک کیا۔

"یہ کس نے کیا ہے؟"

کوئی جواب نہیں آیا۔ہوا کا ایک جھونکا گزرا۔سقراط نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

"میں جانتا ہوں یہ تم لوگوں کا کام ہے۔"

اس بار چند سر اور جھک گئے۔

"تو جس نے یہ پلان بنایا تھا، وہ آگے آ جائے۔"

خاموشی۔پوری ٹیم جیسے سانس روک کر کھڑی تھی۔پھر آخری قطار سے ایک لڑکا آگے بڑھا۔زاویار۔وہ دو قدم آگے آیا، پھر رک گیا۔اور اس کے پیچھے...ایک ایک کر کے پوری ٹیم آگے آ گئی۔سقراط نے سب کو دیکھا۔زاویار نے گردن اٹھائی۔

"یہ ہم سب کا پلان تھا، کوچ۔"

سقراط نے گہری سانس لی۔کچھ لمحوں تک وہ کچھ نہیں بولا۔

"ٹورنامنٹس شروع ہونے والے ہیں اور تم لوگ پریکٹس کرنے کے بجائے غنڈہ گردی کرتے پھر رہے ہو؟"

کوئی جواب نہیں آیا۔سب سر جھکائے کھڑے تھے۔

" کوئی شرم ہے؟"

" کوچ..." زاویار نے سر اٹھایا۔"فیلڈ میں آپ جو کہیں گے، ہم وہ کریں گے۔"

سقراط کی بھنویں ذرا بلند ہوئیں۔

"لیکن فیلڈ کے باہر..." وہ ذرا ہچکچایا۔"فیلڈ کے باہر ہم وہی کریں گے جو ہمیں ٹھیک لگے گا۔"

پوری ٹیم خاموش تھی۔

"معذرت کے ساتھ، کوچ..." اس نے گردن ذرا بلند کی۔"ہم کسی کے غلام نہیں ہیں۔"

چند لمحوں کے لیے گراؤنڈ پر ایسی خاموشی چھائی کہ دور کہیں سیٹی کی آواز بھی صاف سنائی دینے لگی۔سقراط نے زاویار کو غور سے دیکھا۔وہ لڑکا خوفزدہ نہیں تھا۔اس کی پیشانی پر صاف صاف بغاوت لکھی تھی۔سقراط کی بھنویں سکڑی رہیں۔ایک لمحہ۔دو لمحے۔پھر...اس کے ہونٹ کے ایک کونے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ٹھیک کہا تم نے۔" پوری ٹیم چونکی۔سقراط نے موبائل جیب میں ڈال لیا۔

"فیلڈ کے باہر جو تم لوگوں نے کیا ہے..." وہ ذرا رکا۔اس کی نظر ایک ایک چہرے سے گزری۔"وہ مُجھے پسند آیا۔"

چندلمحوں تک کسی کو یقین ہی نہیں آیا کہ انہوں نے صحیح سنا ہے۔ پھر ایک ساتھ کئی گردنیں اٹھیں۔ زاویار کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پیچھے کھڑے کھلاڑی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ سقراط نے سپاٹ لہجے میں بات جاری رکھی۔

"لیکن اگلی بار کسی کو مارنے سے پہلے مُجھے بتا دینا۔ کم از کم یہ تو پتا ہو کہ میرے کھلاڑی ٹورنامنٹ سے پہلے جیل کیوں جا رہے ہیں۔"

ٹیم میں دبی دبی ہنسی ابھری۔ زاویار کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

"جی، کوچ۔"

سقراط نے فوراً انگلی اٹھائی۔ "اور زاویار؟"

"جی؟"

"شاہ زیب کے گھر والوں کو فون تم نے کیا تھا؟"

زاویار کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ "جی۔"

"کیا کہا تھا؟"

زاویار نے انتہائی معصومیت سے جواب دیا۔

"یہی کہ آپ کے بیٹے نے بہت اچھا ہاکی میچ کھیلا ہے، بس تھوڑا سا..." اس نے مناسب لفظ ڈھونڈنے کا ڈرامہ کیا۔ "فاؤل ہو گیا تھا۔"

پوری ٹیم ہنس دی۔ سقراط نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبی سانس لی۔

"لیکن ایک بات سمجھ لو۔ایسے کام احتیاط سے کیے جاتے ہیں۔"اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیے۔"تم لوگ ہاکیاں لے کر نکل گئے تھے؟" چند کھلاڑیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اگر پکڑے جاتے تو؟"اب سب کے چہرے سنجیدہ تھے۔

"ہاکی کھیلنے والے لگتے ہو یا ثبوت چھوڑنے والے؟"

اس بار کسی نے ہنسنے کی جرأت نہیں کی۔سقراط نے سر جھٹکا۔

"واقعی بے وقوف ہو تم لوگ۔"

سقراط نے گراؤنڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"جتنے خونخوار تم لوگ فیلڈ کے باہر ہوتے ہو نا...اتنا ہی خون فیلڈ کے اندر بھی چاہیے مُجھے..."

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے رہا تھا۔

"مخالف کی ہاکی تمہارے سامنے ہو تو ایسے نہیں کھڑے ہونا جیسے رشتہ دار کی شادی میں سلامی لینے آئے ہو۔گیند چھیننی ہے تو چھینو۔"

اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"راستہ بند کرنا ہے تو کرو۔گول چاہیے تو جان لگا دو۔لیکن ایک بات..."

وہ ذرا رکا۔"میری ٹیم کبھی ڈر کر نہیں کھیلے گی۔"

زاویار کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"ہم جی جان لڑا دیں گے، کوچ!"

سقراط نے سیٹی منہ میں رکھی۔

"چلو پھر۔ دکھاؤ مُجھے تم لوگ کیا کر سکتے ہو۔"

اگلے ہی لمحے ہا کیاں اٹھ گئیں۔ جو ٹیم چند لمحے پہلے خاموش کھڑی تھی، اب میدان میں پھیل چکی تھی۔

"پوزیشن!" سقراط کی آواز گونجی۔ زاویار نے فوراً کھلاڑیوں کو اشارے کیے۔

"فارمیشن!"

گیند میدان میں آئی۔ پہلا پاس۔ دوسرا پاس۔ تیسرا کھلاڑی آگے بڑھا مگر گیند اس سے ذرا دور نکل گئی۔

"روکو!"

سقراط کی سیٹی تیزی سے بجی۔

"زاویار!"

زاویار فوراً رک گیا۔

" گیند تمہارے پاؤں کی جاگیر نہیں ہے۔اسے اپنے ساتھ نہیں گھسیٹنا، اسے چلانا ہے۔"

"جی کوچ!"

"دوبارہ!"

گیند پھر چلی۔اس بار پاس زیادہ تیز تھا۔ایک کھلاڑی نے ہاکی گھمائی، گیند مخالف سمت نکل گئی۔

سقراط نے فوراً سیٹی بجائی۔

"ہاکی زمین پر...آسمان میں نہیں۔"

"یس کوچ!"

"اور تم..."

ایک اور کھلاڑی رک گیا۔

"تمہیں گیند چاہیے یا اس کے ساتھ دوستی کرنی ہے؟"

" گیند چاہیے، کوچ!"

"تو پھر اس کے پیچھے بھاگو!"

وہ خود بھی میدان کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔کبھی ہاتھ سے اشارہ کرتا، کبھی سیٹی بجاتا، کبھی کسی کی پوزیشن درست کرواتا۔

"بائیں! بائیں کہاہے؟"

ایک کھلاڑی فوراً دوسری جانب بھاگا۔

"یہ بائیں نہیں ہے، تمہارا دوسرا بائیں ہے؟"

پھر سیٹی بجی۔

"دوبارہ!"

اس بار رفتار بدل گئی۔ ہاکیاں گھاس پر تیزی سے چلنے لگیں۔ جوتوں کی دھمک، گیند کے ہاکی سے ٹکرانے کی آواز اور سقراط کی مسلسل سیٹیاں پورے گراؤنڈ میں پھیل گئیں۔

"فاسٹ!"

"پاس۔"

"موو!"

کھلاڑی آگے بڑھے۔

"زاویار، خالی جگہ دیکھو! کھلاڑی نہیں، جگہ دیکھو!"

زاویار نے فوراً سمت بدلی۔ گیند اس کی ہاکی تک پہنچی۔ وہ پوری قوت سے آگے بڑھا۔

"گول!"

گیند جال سے ٹکرائی۔ پورا گراؤنڈ ایک لمحے کے لیے شور سے بھر گیا۔ سقراط نے سیٹی منہ سے نکالی۔ اس کے چہرے پر وہی فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی۔ زاویار ہانپتے ہوئے مسکرایا۔

"کیسا تھا، کوچ؟"

سقراط نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"برا نہیں تھا۔"

"بس؟"

"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جن سے جیتنا ہے وہ بھیڑیے ہیں۔"

زاویار کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ سقراط نے سیٹی دوبارہ منہ میں رکھی۔

"دوبارہ!"

"کوچ! ابھی تو..."

"ٹورنامنٹ میں کوئی تمہیں وقت دے گا؟"

سب نے ایک ساتھ ہاکیاں سنبھال لیں۔

"نو کوچ!"

سقراط نے ہلکا سا سر ہلایا۔

"تو پھر آج وقت ضائع کرنے کی عادت مت ڈالو۔"

اور اگلے ہی لمحے پوری ٹیم پھر دوڑ رہی تھی۔صبح کی خنکی کب پسینے میں بدل گئی، کسی کو خبر نہ ہوئی۔سقراط کی آواز، سیٹی اور ہا کیوں کی ٹکر...قادری اسپورٹس کالج کا گراؤنڈ پھر سے زندہ ہو چکا تھا۔

☆...☆...☆

بزدار پیلس کے دائیں حصے میں واقع الماس کا کمرہ ہمیشہ باقی کمروں سے کچھ مختلف محسوس ہوتا تھا۔دروازہ کھلا تھا۔اندر ہلکی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور بڑی کھڑکیوں سے آتی رات کی ہوا پردوں کو بہت آہستگی سے ہلا رہی تھی۔کمرے میں قیمتی فرنیچر تھا، مگر اس سب کے باوجود وہاں ایک عجیب سی سادگی تھی۔جیسے اس جگہ کو خوبصورت رکھنے سے زیادہ اسے کسی کے لیے قابلِ برداشت رکھنے کی کوشش کی گئی ہو۔الماس بستر پر نیم دراز تھی۔اٹھائیس انتیس برس کی عمر میں اس کے چہرے پر وہ تھکن تھی جو عموماً عمر کے آخری حصے میں آتی ہے۔بیماری، درد اور ایک لمبی ذہنی جنگ نے اس کے نقوش سے شوخی چھین لی تھی۔گردن سے نیچے اس کا جسم بے جان تھا اور زندگی کی معمولی سی ضرورت کے لیے بھی اسے کسی دوسرے کی مدد درکار ہوتی تھی۔

اس کے بستر کے قریب بشریٰ بی بیٹھی تھیں۔سر پر دوپٹہ اچھی طرح جما رکھا تھا اور ہاتھ میں قرآن پاک تھا۔ان کی آواز میں ایسی مٹھاس تھی کہ راہداری سے گزرتے ہوئے قدم خود بخود ٹھہر جاتے۔وہ سورہ رحمٰن کی تلاوت کر رہی تھیں۔الفاظ کمرے سے نکل کر راہداری میں پھیل رہے تھے۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ

عالیہ کے قدم رک گئے۔وہ دروازے کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔نہ جانے کتنی دیر۔اس نے اندر جانے کی کوشش بھی نہیں کی۔بس خاموشی سے کھڑی سنتی رہی۔آواز میں ایسی روانی تھی جیسے کسی نے قرآن پڑھا نہیں، کسی کے دل پر آہستہ آہستہ روشنی اتاری ہو۔تلاوت ختم ہوئی تو کمرے میں چند لمحوں کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔الماس نے آنکھیں کھولیں۔سامنے دروازے سے ٹیک لگائے عالیہ کھڑی تھی۔سر پر دوپٹے کا پلو جما ہوا، چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ الماس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"اوہ! عالیہ...اندر آؤ۔تم کب آئیں؟"

عالیہ جیسے اچانک بیدار ہوئی۔

"ابھی..."

وہ جھجکتے ہوئے اندر آ گئی۔الماس نے بشریٰ بی کی طرف دیکھا۔

"بشریٰ بی، آپ جائیں۔"

"جی بی بی۔"

بشریٰ بی نے قرآن پاک احتیاط سے بند کیا، اسے غلاف میں رکھا اور اٹھ کر باہر چلی گئیں۔دروازہ بند ہو گیا۔عالیہ بستر کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔چند لمحے وہ خاموشی سے الماس کو دیکھتی رہی۔

"مُجھے نہیں معلوم تھا آپ قرآن پاک سنتی ہیں۔"

الماس نے اسے دیکھا۔

"اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے؟"

اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"یہ تو روح کی غذا ہے۔جسم کو کھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور روح کو ذکر کی۔"

عالیہ خاموش ہوگئی۔الماس کی بات سادہ تھی مگر عالیہ کے لیے اتنی سادہ نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر الماس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

"آپ بہت حوصلے والی ہیں، الماس آپی۔"

الماس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔

"نہیں۔"

"نہیں؟" عالیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"حوصلہ شاید میرے پاس بھی نہیں تھا۔" اس نے چھت کی طرف دیکھا۔" کچھ چیزیں انسان خود نہیں سیکھتا، عالیہ۔حالات اسے سکھا دیتے ہیں۔"

عالیہ نے کچھ نہیں کہا۔وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"حادثے کے بعد میں نے بہت عرصہ اللہ سے شکوہ کیا۔"

الماس نے اعتراف کیا۔

"پھر ایک دن خیال آیا کہ اگر میں ہر وقت اس چیز کو دیکھتی رہوں جو مجھ سے چھین لی گئی ہے تو شاید مُجھے وہ چیزیں کبھی دکھائی ہی نہ دیں جواب

بھی میرے پاس ہیں۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"اپنی زندگی دوبارہ شروع کی۔"

الماس نے بہت ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اپنے طریقے سے۔" کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔" کیونکہ اللہ کو یہی پسند ہے۔"

"کاش اللہ مُجھے بھی پسند کرتا ہو۔"عالیہ کے لبوں سے بے اختیار پھسلا۔ الماس کی آنکھیں اس پر ٹھہر گئیں۔عالیہ خود بھی اپنے جملے پر چونکی۔

"میرا مطلب..."

"میں سمجھ گئی۔"الماس کی آواز میں کوئی ملامت نہیں تھی۔

"لیکن تمہیں کیسے معلوم کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتا؟"

عالیہ تذبذب کا شکار ہوئی۔اس سے کوئی جواب نہیں بن پایا پھر اس نے الٹا سوال کیا۔

"اللہ کیسے لوگوں کو پسند کرتا ہے؟"

الماس نے اسے غور سے دیکھا۔

"اچھا سوال ہے۔"

اس نے چند لمحے سوچا۔ "اللہ حیا والوں کو پسند کرتا ہے۔"

"حیاء والے کون ہوتے ہیں؟"

"جو پاکیزگی اختیار کرتے ہیں۔ جو اپنی غلطی پر اَڑتے نہیں، پلٹ آتے ہیں۔"

عالیہ پوری توجہ سے سن رہی تھی۔

"اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

الماس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

"جو دکھ میں بھی اپنے رب سے منہ نہیں موڑتے۔"

"اور؟"

"جو عدل کرتے ہیں۔ جو اپنے فائدے کے لیے کسی دوسرے کا حق نہیں کھاتے۔ جو غصے میں بھی حد نہیں بھولتے۔"

عالیہ کی انگلیاں بے اختیار آپس میں الجھ گئیں۔

"اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

"یعنی؟" عالیہ متجسس نظر آتی تھی۔

"وہ لوگ جو صرف اتنا نہیں کرتے جتنا ان پر لازم ہو۔ بلکہ جہاں ان کے پاس کسی کا دل رکھنے، کسی کی مدد کرنے یا کسی کی تکلیف کم کرنے کا موقع ہو، وہاں اپنی ذات سے آگے دیکھتے ہیں۔"

عالیہ کی نظریں کہیں دور جا ٹھہریں۔ "اور بتائیں کیسے ہوتے ہیں حیاء والے؟"

اس نے بے ساختہ پوچھا۔ الماس مسکرائی۔

"حیا صرف لباس کی نہیں ہوتی، عالیہ۔"

عالیہ کی نگاہ فوراً اس کے چہرے پر آئی۔

"حیا نگاہ میں بھی ہوتی ہے، زبان میں بھی، ارادے میں بھی۔ حیا یہ بھی ہے کہ انسان جانتا ہو کہ سامنے والا اس کا محرم نہیں، تو اپنے رویے کی حد پہچانے۔"

عالیہ کے ذہن میں اچانک ایک چہرہ ابھرا۔ کلاس میں لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے اس کی نظریں ہمیشہ محتاط رہتی تھیں۔ کسی لڑکی سے گفتگو کرتے وقت وہ ہچکچاتا نہیں تھا مگر نگاہوں کو بھٹکنے نہیں دیتا تھا۔ عالیہ نے فوراً پہلو بدل لیا۔

"اور؟"

"اور حیاء والے متقی ہوتے ہیں۔" الماس نے بات جاری رکھی۔

"متقی؟" عالیہ نے بے تابی سے پوچھا۔ الماس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"متقی وہ نہیں جو دنیا کے سامنے بہت نیک دکھائی دے۔"

"تو پھر؟"

"وہ جوا کیلے میں بھی اپنے رب سے ڈرتا ہو۔"

عالیہ جیسے خاموش ہوگئی۔اس نے افسردہ سانس لیا۔وہ حیاء والوں میں کہیں بھی نہیں آتی تھی۔آہ! یہ حیاء والا ہونا اتنا مشکل کیوں تھا؟

"اللہ اُن لوگوں کو بھی پسند کرتا ہے جو اپنے وعدے نبھاتے ہیں، جو توبہ کرتے ہیں، جو پاکیزگی اختیار کرتے ہیں، جو انصاف کرتے ہیں اور جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں۔"

الماس نے قدرے توقف کیا۔"اور ایک بات یاد رکھنا۔" وہ عالیہ کے چہرے کی افسردگی بھانپ چکی تھی۔عالیہ نے فوراً نظریں اٹھائیں۔

"اللہ کی پسند حاصل کرنے کے لیے کامل ہونا ضروری نہیں۔بس سچا ہونا ضروری ہے۔"

کمرے میں پھر خاموشی اتر آئی۔عالیہ کے اندر جیسے کئی سوال ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔کامل ہونا ضروری نہیں...بس سچا ہونا ضروری ہے۔

"الماس آپی..."

"ہمم؟"

"اگر کوئی شخص بہت غلطیاں کر چکا ہو تو؟"

الماس نے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"تو اسے اللہ سے دور ہونے کے بجائے اللہ کی طرف لوٹنا چاہیے۔"

"اور اگر وہ بار بار غلطی کرے؟"

"تو بار بار توبہ کرے۔"

"اور اگر وہ کچھ غلط کرنے جا رہا ہو؟ کچھ ایسا جو ٹھیک نہ ہو پھر؟"

"اللہ کو دھڑلے سے گناہ کرنے والے لوگ نہیں پسند۔ یہ کام تو شیطان کا ہے۔ انسان اس لئے تھوڑی نہ بنا ہے۔"

"بار بار توبہ کرنا اور پھر وہی گناہ کرنا؟ کیا اللہ اس پر خفا نہیں ہوتا؟"

الماس مسکرائی۔

"اللہ کے دروازے انسانوں کے دروازوں جیسے نہیں ہوتے، عالیہ۔ وہاں دستک دینے والا یہ نہیں سنتا کہ تم پہلے کتنی بار واپس گئی تھیں۔"

عالیہ کے لب ہلکے سے کھلے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ بشریٰ بی اندر داخل ہوئیں۔

"بی بی، دوا کا وقت ہو گیا ہے۔"

الماس نے سر ہلایا۔ بشریٰ بی نے دوا اور پانی کا گلاس میز پر رکھا۔ عالیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلتی ہوں۔"

"اتنی جلدی؟"

" کچھ کام ہے۔"

الماس نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

"عالیہ؟"

وہ دروازے پر رک گئی۔

"جی؟"

"اپنے سوالوں سے مت بھاگنا۔"

عالیہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔الماس مسکرا رہی تھی۔

" کبھی کبھی سوال اللہ تک پہنچنے کا راستہ بن جاتے ہیں۔"

عالیہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"جی ضرور..."

وہ باہر نکل گئی۔دروازہ بند ہوا۔الماس نے بشریٰ بی کی مدد سے دوالی اور دوبارہ آنکھیں موند لیں۔اور راہداری میں چلتی عالیہ کے ذہن میں ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا تھا۔

"اللہ کی پسند حاصل کرنے کے لیے کامل ہونا ضروری نہیں...بس سچا ہونا ضروری ہے۔"

☆...☆...☆

سلویٰ کے ہاتھ میں فون تھا اور انگلیاں مسلسل اس کی پشت پر چل رہی تھیں۔ کبھی وہ کمرے میں چند قدم چلتی، پھر پلٹ آتی۔ کھڑکی کے باہر صبح پوری طرح پھیل چکی تھی مگر اس کے اندر جیسے رات ٹھہری ہوئی تھی۔ اسے ایک ہی بات کھائے جا رہی تھی۔ گھر سے باہر نہیں نکلنا تھا۔ اسے باہر نہیں جانے دیا جا رہا تھا۔ گارڈز اسے گیٹ تک بھی نہیں جانے دیتے تھے۔ حق نے یہ حکم اتنے سادہ انداز میں دیا تھا جیسے اس کے لیے یہ کوئی معمولی بات ہو۔ مگر سلویٰ کے لیے نہیں تھی۔ اس کے لیے اپنے ہی گھر کی چار دیواری اچانک تنگ ہو گئی تھی۔ اس نے فون پر مسٹر خان کا نمبر ملایا تھا۔ چند بیل کے بعد کال اٹھا لی گئی۔

"ہیلو ڈیڈ!"

دوسری جانب مسٹر خان کی آواز آئی۔ "ہاں بیٹا، کیا ہوا؟ صبح صبح خیریت؟"

"خیریت؟" سلوی کے ہونٹوں سے ایک تلخ ہنسی نکلی۔ "آپ کو کیا لگتا ہے یہاں خیریت ہے؟"

"کیا ہوا ہے؟"

"حق نے مُجھے گھر سے باہر نکلنے سے منع کر دیا ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر مسٹر خان کی آواز سنائی دی۔ "کیوں؟"

"مُجھے کیا پتا کیوں؟ اس نے بس کہہ دیا ہے کہ کچھ دن گھر سے باہر مت نکلنا۔ نہ کوئی وجہ، نہ کوئی وضاحت۔ بس حکم دے دیا۔"

"سلویٰ، شاید کوئی وجہ ہو۔"

"ڈیڈ!" اس کی آواز بلند ہوئی۔ "آپ بھی یہی کہیں گے؟"

"میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ پہلے بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"آج وہ مُجھے گھر میں قید کر رہا ہے لیکن کل کو شاید میرے سانس لینے پر بھی پابندی لگا دے۔"

مسٹر خان نے گہرا سانس لیا۔"سلوی، جذبات میں آ کر بات مت کرو۔"

"میں جذبات میں نہیں ہوں۔ میں بالکل ہوش میں ہوں ڈیڈ!"

وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ باہر چند ملازم لان میں کام کر رہے تھے۔ایک عورت آزادی سے باغ کے دوسرے سرے تک جا رہی تھی اور سلویٰ کو پہلی بار لگا جیسے وہ خود اپنے گھر میں قید ہو۔

"پتا ہے مُجھے سب سے زیادہ کس چیز سے ڈر لگتا ہے؟"

مسٹر خان نے گہری سانس لی۔

"کہ آج وہ صرف باہر جانے سے روک رہا ہے۔کل وہ کہے گا فلاں سے مت ملو۔ پھر کہے گا فون استعمال مت کرو۔ پھر کہے گا گھر سے اکیلے مت نکلو۔اور پھر..."

اس کی آواز میں کپکپاہٹ آ گئی۔

"پھر مجھ پر ہاتھ اٹھائے گا۔"

"سلویٰ!"

"اور ایک دن اپنی ماں کی طرح میرا قتل کر دے گا۔"

دوسری جانب یکدم خاموشی چھا گئی۔سلوی نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"جیسے اس کی ماں نے اس کے باپ کو مارا تھا۔"

"سلویٰ،سوچ سمجھ کر بولو۔"مسٹر خان کی آواز اس بار سخت تھی۔

"میں سوچ سمجھ کر ہی بول رہی ہوں۔"

"تم حق کو اس کی ماں کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتیں۔"

"میں اسے اس کی ماں کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا رہی۔میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ میں اس آدمی کے ساتھ خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتی۔"

"حق ایسا نہیں ہے۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"کیونکہ میں اسے جانتا ہوں۔"

"آپ اسے مجھ سے زیادہ جانتے ہیں؟"

"میں تمہیں بہت اچھے سے جانتا ہوں سلویٰ..."

"تو پھر شاید آپ کو اپنی بیٹی سے زیادہ اس پر اعتبار ہے۔"

"بات اعتبار کی نہیں ہے۔"

"پھر کس بات کی ہے؟"

"اس بات کی کہ حق کا مزاج سخت ضرور ہے، لیکن وہ بے وجہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔"

"اور اگر کل وہ نقصان پہنچا دے تو؟"

"آج وہیں رہو میں خود کل آؤں گا۔"

"کل کیوں؟" سلویٰ کا لہجہ بھیگ گیا۔ "مُجھے کل کا انتظار کیوں کرنا چاہیے؟ مُجھے ابھی آپ کے پاس آنا ہے۔"

"نہیں۔ ابھی تم کہیں نہیں آؤ گی۔"

سلویٰ کے چہرے پر بے یقینی پھیل گئی۔

"آپ مُجھے روک رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"ڈیڈ!" سلویٰ جیسے صدمے سے ساکت ہوئی۔

"سلوی، میری بات سنو۔ اگر حق نے تمہیں گھر سے باہر جانے سے روکا ہے تو ممکن ہے اسے کوئی خطرہ محسوس ہوا ہو۔"

"مُجھے خطرہ ہے یا وہ خود خطرہ ہے؟"

"تمہیں یہ معلوم نہیں۔مُجھے بھی نہیں۔اسی لیے پہلے میں اس سے بات کروں گا۔"

"وہ آپ کو کیا بتائے گا؟ کہ میں بہت خوش ہوں؟ کہ میں اپنی مرضی سے اس گھر میں بند ہوں؟"

"وہ مجھ سے سچی بات کرتا ہے۔"

"اور اگر اس نے جھوٹ بولا؟"

"تو میں تمہاری طرف کھڑا ہوں گا۔"

"آپ ہر بار یہی کہتے ہیں۔"

"کیونکہ میں تمہارا باپ ہوں۔"

سلوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر غصہ ابھی باقی تھا۔

"تو پھر مُجھے اپنے پاس بلائیں۔"

"میں تمہیں غصے میں گھر سے اٹھا کر نہیں لاؤں گا۔کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آج کے غصے میں تم ایسا قدم اٹھاؤ جس کا نقصان کل تمہیں ہو۔"

سلوی نے بے اختیار آنکھیں پونچھیں۔"آپ کو پتا ہے نا میں یہاں مزید نہیں رہ سکتی؟"

"میں اتنا جانتا ہوں سلویٰ کہ حق سے زبردستی شادی کرنا بھی تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔تم کسی ایک چیز پر ٹک نہیں سکتیں۔کچھ عرصے بعد تمہارا چیزوں سے دل اکتا جاتا ہے لیکن شادی ایسا بندھن نہیں ہے۔تمہیں یہ سمجھنا ہوگا کہ تم اب صرف سلویٰ خان نہیں ہو جس نے جو چاہا وہ پایا۔تم ایک

بچے کی ماں ہو۔تمہارے بچے کو تمہاری ضرورت ہے۔تم آج غصے میں ہو،کل کو تمہیں پچھتاوا ہوگا اور میں ایسا نہیں چاہتا۔"

"مُجھے اپنے بچے کی پرواہ ہے لیکن میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔"

مسٹر خان نے ضبط سے آنکھیں میچیں۔انہیں وہ دن آج بھی یاد تھا جب سلویٰ نے حق سے شادی کے لیے خودکشی کی دھمکی دی تھی۔حق ابھی شادی کے لیے تیار نہیں تھا مگر سلویٰ کی ضد کے باعث امجد بزدار نے اسے شادی کے لیے تیار کیا تھا۔اب وہ کس منہ سے اپنی بیٹی کی طرف داری کرے؟

"میں تمہیں ہمیشہ کے لیے وہاں رہنے کو نہیں کہہ رہا۔"

"تو پھر؟"

"میں حق سے بات کرتا ہوں۔اگر مسئلہ واقعی اتنا ہی سنگین ہے جتنا تم کہہ رہی ہو تو تمہیں وہاں سے نکالنے میں ایک لمحہ نہیں لگاؤں گا۔"

"اور اگر وہ مُجھے جانے نہ دے؟"

مسٹر خان چند لمحے خاموش رہے۔"تو پھر میں خود آؤں گا۔"

"آپ وعدہ کر رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"پکا؟"

"پکا۔"

وہ کچھ لمحے خاموش رہی۔ پھر اچانک اس کے لہجے میں پھر تلخی آ گئی۔

"لیکن مُجھے سمجھ نہیں آتی آپ اس کی طرف داری کیوں کر رہے ہیں۔"

"میں اس کی طرف داری نہیں کر رہا۔ میں تمہیں جذباتی فیصلہ کرنے سے روک رہا ہوں۔"

"مرد ہمیشہ مردوں کی طرف داری کرتے ہیں۔"

"تم اس وقت کسی کی بات سننے کی حالت میں نہیں ہو سلویٰ۔"

سلویٰ نے غصے سے آنکھیں بند کر لیں۔ اسکا چہرہ سرخ پڑ چکا تھا۔ گردن کی نسیں ابھر آئیں تھیں۔ "میں یہاں مزید نہیں رہ سکتی، ڈیڈ۔"

"بس ایک دن اور..."

وہ خاموش رہی۔

"اور تب تک گھر سے باہر نہیں نکلو،" مسٹر خان نے قدرے نرمی سے کہا۔ "یہ میری درخواست ہے، حکم نہیں۔"

سلویٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"سلویٰ تم سن رہی ہو نا؟"

"ٹھیک ہے۔" اس کا لہجہ بے جان تھا۔ "لیکن اگر کل تک کچھ حل نہیں ہوا تو میں خود آپ کے پاس آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"چاہے حق کچھ بھی کہے۔"

"میں دیکھ لوں گا۔"

"اور ڈیڈ..."

"ہاں؟"

سلویٰ کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر گال پر بہہ گیا۔

"مُجھے یہاں اکیلا مت چھوڑیے گا۔"

دوسری جانب مسٹر خان جیسے ساکت ہوئے۔انہیں کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"میں نہیں چھوڑوں گا۔"

کال ختم ہوگئی۔سلویٰ کافی دیر فون کو دیکھتی رہی۔پھر اس نے آہستہ سے فون نیچے کیا۔ باہر دنیا معمول کے مطابق چل رہی تھی۔کبھی کبھی خطرہ وہ نہیں ہوتا جو نظر آ رہا ہو۔کبھی خطرہ وہ ہوتا ہے جس کا نام بھی آدمی نہیں جانتا۔اور حق...وہ جانتا تھا؟
یہی بات سلویٰ کو سب سے زیادہ خوفزدہ کر رہی تھی۔

☆...☆...☆

شنگیر ہاؤس کی سہ پہر میں ایک عجیب سی خاموشی اتر آئی تھی۔وہی گھر تھا،وہی دیواریں،وہی صحن،وہی کمرے...مگر زہرہ بیگم کے جانے کے

بعد جیسے گھر کی آواز ہی مرگئی تھی۔کبھی اس گھر میں دوپہر کے وقت بھی کہیں نہ کہیں ہنسی سنائی دیتی تھی۔تارہ اورنوفہ کے سکول سے واپسی پران کے قدموں کی دھمک،زہرہ بیگم کی آواز،نیمل کا کسی بات پر جھنجھلانا،زہرہ بیگم کا کچن سے انہیں آواز دینا...سب کچھ زندگی کا حصہ تھا۔اب زندگی موجود تھی۔بس زندگی جیسی نہیں رہی تھی۔دوپہر ڈھل رہی تھی۔تارہ اورنوفہ سکول سے واپس آ چکی تھیں۔لاونج میں دادی اورآصفہ پھوپھوآمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ان کے درمیان چائے کے کپ رکھے تھے جو جانے کب سے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔کسی کو چائے پینے کی خواہش نہیں تھی۔کچن سے روٹی پکنے کی خوشبوآ رہی تھی۔نیمل چولہے کے سامنے کھڑی ایک کے بعد ایک روٹی بنا رہی تھی۔اس کے بال جلدی میں باندھے گئے تھے۔چندلٹیں بار بار اس کی پیشانی پر آ رہی تھیں اوروہ ہر چند لمحوں بعد کلائی سے انہیں پیچھے کر دیتی۔اس کے چہرے کی وہ پرانی شادابی کہیں نہیں تھی۔کبھی وہ اچانک رک کر کچھ سوچنے لگتی۔کبھی چولہے کی آنچ کم کرتے ہوئے اس کی نگاہ خلا میں ٹھہر جاتی۔اور کبھی کسی معمولی سی بات پر اس کے اندر جمع سارا غصہ باہر آنے کو بے قرار ہو جاتا۔صبح نامرہ کو ڈانٹ دیا تھا بعد میں اسے خود اپنی آواز بری لگی تھی۔وہ جانتی تھی نامرہ بھی انہی حالات سے گزر رہی تھی مگر دکھ کبھی کبھی انسان کو اتنا بے بس کر دیتا ہے کہ وہ جسے سب سے زیادہ چاہتا ہے، اسی پر اپنا غصہ نکال دیتا ہے۔نیمل نے روٹی کو پلٹا۔دروازے کے قریب ہلکے قدموں کی آہٹ ہوئی۔یونیفارم تبدیل کرنے کے بعد سادہ کپڑوں میں ملبوس نوفہ کچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔ کچھ لمحے وہ نیمل کو دیکھتی رہی۔نیمل نے اسے نہیں دیکھا۔نوفہ نے ایک گہری سانس لی۔پھر بہت سنجیدگی سے بولی۔

"بھائی کہتے ہیں اگر غصہ آئے تو تین تک گنو۔"

نیمل کا ہاتھ رک گیا۔اس نے آہستہ سے آنکھیں بند کیں۔ایک...دو...تین۔پھر اس نے سانس باہر نکالی۔

"تمہارے بھائی نے یہ بھی بتایا تھا کہ غصہ آنے پر سامنے والے کا گلا نہیں دبانا؟"

نوفہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔"نہیں۔"

"اچھا ہے۔کم از کم کچھ تو نہیں بتایا۔"

نوفہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی رہی۔

"بھائی کہتے ہیں غصے میں آدمی وہ بات کہہ دیتا ہے جس کا بعد میں ساری عمر افسوس رہتا ہے۔"

نیمل نے روٹی بیلتے ہوئے اسے دیکھا۔"تمہارے بھائی بہت سمجھدار ہو گئے ہیں۔"

"وہ پہلے بھی سمجھدار تھے۔"

"ہاں،"نیمل کے لبوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ آئی،"بس خود پر سمجھداری استعمال نہیں کرتے تھے۔"

نوفہ بھی مسکرادی۔مگر وہ مسکراہٹ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکی۔اس گھر میں مسکرانا بھی اب جیسے کسی پرانے گناہ کی یاد تھا۔نوفہ نے کچن کے اندر قدم رکھا۔

"آپی؟"

"ہمم؟"

"اب گھر میں سب لوگ اتنے خاموش کیوں رہتے ہیں؟"

نیمل نے بیلن میز پر رکھ دیا۔اس نے کچھ لمحے نوفہ کو دیکھا پر کہا کچھ نہیں۔پندرہ سال کی عمر میں بچے موت کو سمجھتے نہیں،صرف کرنے والے کی کمی محسوس کرتے ہیں۔انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ کسی کے نہ ہونے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔بس اتنا پتا ہوتا ہے کہ جس شخص کی آواز ہر وقت سنائی دیتی تھی،اب نہیں آتی۔جس کے کمرے کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا،اب بند رہتا ہے۔جس کے ہاتھ کھانے پر سب کو مجبور کرتے تھے،اب وہ ہاتھ نہیں ہیں۔

"دادی بہت اداس ہیں۔پھوپھو بھی۔پاپا بھی۔سب اداس ہیں۔آپ بھی ہیں نا؟"

نیمل نے آخری روٹی بیلنے کے لیے آٹا اٹھایا۔

"لیکن زندگی رکتی نہیں نوفہ۔"

"کاش رک جاتی۔"

نیمل کا ہاتھ پھر ٹھہر گیا۔اس نے اس بار بھی کچھ نہیں کہا۔نوفہ نے اپنی انگلیاں آپس میں پھنسالیں۔

"امی ہوتیں تو..."

جملہ ادھورا رہ گیا۔نیمل نے اس کی طرف دیکھا۔

"تو؟"

نوفہ نے سر جھکالیا۔"کچھ نہیں۔"

نیمل نے آخری روٹی بیل کر توے پہ ڈال دی۔

"جو دل میں ہے کہہ دو۔"

"کچھ نہیں ہے۔"

"نوفہ...تمہیں مجھ سے جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں ہے۔"

نوفہ نے ایک لمحے کو اسے دیکھا، پھر ہلکا سا مسکرادی۔

"آپ بھی تو صبح دادی سے کہہ رہی تھیں کہ آپ کو غصہ نہیں آیا تھا۔ کیا وہ جھوٹ نہیں تھا؟"

نیمل گہری سانس لے کر مسکرائی۔ "تم بہت بدتمیز ہو رہی ہو۔"

"بھائی کہتے ہیں سچ بولنے والے بدتمیز نہیں ہوتے۔"

"تمہارے بھائی کو بہت کچھ کہنا آتا ہے۔"

"ہاں۔ امی بھی کہتی تھیں وہ بہت کچھ جانتا ہے۔"

نیمل کی مسکراہٹ فوراً بجھ گئی۔ اس نے روٹی توے سے اتاری اور ہاٹ پاٹ میں رکھ دی۔

"چلو، اب تم جا کر تارہ کو بلا لاؤ۔ کھانا لگاتے ہیں۔"

وہ پلٹی۔ اور پھر رک گئی۔ اس بار واقعی رک گئی۔ نوفہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ نیمل کی نگاہ پہلے اس کے چہرے پر گئی۔ پھر گردن پر۔ پھر کندھوں پر۔ پھر جیسے بے اختیار اس کے پورے وجود کا جائزہ لینے لگی۔ کچھ تھا۔ بہت معمولی سا مگر تھا۔
نوفہ کا چہرہ پہلے کی نسبت بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے گالوں پر تازگی نہیں تھی۔ آنکھیں تھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر ہلکی سی سوجن تھی یا شاید نیمل کا وہم تھا۔ مگر یہ صرف چہرہ نہیں تھا۔ اس کے کپڑے بھی پہلے کی نسبت کچھ مختلف انداز میں جسم سے لگ رہے تھے۔ نیمل نے بھنویں سکیڑ لیں۔

"تم ٹھیک ہو؟"

نوفہ نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پکی بات؟"

"جی آپی۔"

نیمل اس کے قریب آئی۔

"مُجھے دیکھو۔"

نوفہ نے نظریں اٹھائیں۔ان آنکھوں میں کچھ تھا۔کچھ ایسا جو ایک پندرہ سالہ بچی اپنی پوری کوشش کے باوجود چھپا نہیں سکتی تھی۔نیمل کا دل بیٹھ سا گیا۔

"تمہاری طبیعت تو خراب نہیں؟"

نوفہ نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔"نہیں۔"

"چکر آتے ہیں؟"

"نہیں۔"

نیمل کی پیشانی پر شکن گہری ہوگئی۔"نوفہ؟"

نوفہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔نیمل کا دل ایک دم نرم پڑ گیا۔

"ادھر آؤ۔"

اس نے دونوں بازو کھول دیے۔نوفہ جیسے اسی لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔وہ تیزی سے آگے بڑھی اور نیمل سے لپٹ گئی۔اس کا سر نیمل کے

کندھے تک آتا تھا۔نیمل نے فوراً اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ایک ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور دوسرے سے اس کی پشت سہلانے لگی۔

" کیا ہوا ہے میری بچی کو؟"

نوفہ نے جواب نہیں دیا۔بس نیمل کے سینے سے لگی رہی۔اس کے کندھے ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے۔

"تم رو رہی ہو؟"

"نہیں۔"

آواز اتنی مدھم تھی کہ خود اس کے کانوں تک بمشکل پہنچی۔نیمل نے اس کے بالوں کو سہلایا۔

"مجھ سے چھپاؤ گی؟"

نوفہ نے سر ہلایا۔"نہیں۔"

"تو بتاؤ۔"

کچھ لمحوں تک صرف نوفہ کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔پھر وہ الگ ہوئی۔نیمل نے اس کے دونوں کندھے تھام کر اسے دیکھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

"جی آپی۔"

"مُجھے لگتا ہے ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہے۔"

نوفہ نے نیمل کے چہرے کو غور سے دیکھا۔اس کے ہونٹ کانپے۔پھر ایسی مسکراہٹ آئی جس میں خوشی نہیں تھی۔

"مُجھے لگا آپ کو پتا نہیں چلے گا۔"

نیمل کے دل میں کچھ چبھ سا گیا۔" کیا پتا نہیں چلے گا؟"

نوفہ نے جواب نہیں دیا۔بس آنکھیں جھکا لیں۔نیمل نے اسے دوبارہ اپنے ساتھ لگا لیا۔

" کیسے پتا نہیں چلے گا؟"اس بار اس کی آواز میں ماں جیسی نرمی تھی۔

"میں تمہاری آپی ہوں۔"

نوفہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔اور نیمل نے محسوس کیا کہ زہرہ بیگم کے جانے کے بعد صرف وہی نہیں بدلی تھی۔اس گھر کے ہر بچے کے اندر کچھ نہ کچھ خاموشی سے ٹوٹ رہا تھا۔نیمل نے نوفہ کو اپنے حصار سے الگ کیا ہی تھا کہ کچن کے کاؤنٹر پر رکھا فون بج اٹھا۔اچانک ابھری ہوئی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔نوفہ نے بے اختیار نیمل کی طرف دیکھا۔نیمل نے ایک نظر فون کی اسکرین پر ڈالی، پھر جیسے اس کے چہرے پر ایک لمحے کو تھکن اور بوجھ اتر آیا۔وہی نمبر تھا۔پچھلے تین دن سے یہی نمبر اسے کال کر رہا تھا۔

"جاؤ،تم سب کو بلاؤ۔کھانا لگ گیا ہے۔"

نوفہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے،مگر نیمل کی نگاہ دیکھ کر خاموش ہوگئی۔وہ کچن سے نکل گئی۔نیمل نے فون اٹھایا۔

"ہیلو؟"

دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی، پھر ایک دبی ہوئی مردانہ آواز ابھری۔

"وکیل صاحبہ! آپ سے کہا ہے ہماری مدد کریں۔"

نیمل نے ضبط سے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ جانتی تھی یہ کون تھا۔ ایک پیشہ ور غنڈہ۔ قتل کے الزام میں جیل میں تھا۔ پہلے نیمل ایسے لوگوں کے کیسز میں غیر رسمی طور پر مدد کیا کرتی تھی۔ کبھی کسی بے گناہ کو قانونی راستہ دکھا دیتی، کبھی کسی غریب خاندان کو وکیل تک پہنچا دیتی۔ مگر اب... اب اس کے اندر دوسروں کے مسائل اٹھانے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

"میں نے آپ سے کہا نا، میں یہ کام چھوڑ چکی ہوں۔ آپ کسی اور سے رابطہ کریں۔"

"ہمیں آپ ہی کی مدد چاہیے۔"

" کیوں؟"

" کیونکہ آپ بے گناہوں کی مدد کرتی ہیں۔"

"اب نہیں کرتی۔"

"لیکن وکیل صاحبہ..."

نیمل نے کچھ سنے بنا ہی کال کاٹ دی۔ چند لمحے فون کو دیکھتی رہی۔ پھر نمبر بلاک کر دیا۔ اس نے فون میز پر رکھا اور ایک گہری سانس لی۔ زندگی میں کچھ دروازے ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسان اس لیے بند نہیں کرتا کہ اندر کچھ نہیں ہوتا بلکہ اس لیے بند کرتا ہے کہ وہ خود مزید اندر جانے کے قابل نہیں رہتا۔ وہ کھانے کی طرف متوجہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد ڈائننگ روم میں میز سجائی جا رہی تھی۔ ایک طرف سے برتن رکھنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور دوسری طرف لاؤنج میں دادی اور آصفہ پھوپھو بیٹھی تھیں۔

آصفہ پھوپھو کی گود میں ایک پرانی سی ڈائری رکھی تھی۔ وہ اس کے سرورق پر انگلیاں پھیر رہی تھیں، جیسے بات کرتے کرتے بھی کسی اور خیال

میں گم ہوں۔

"طارق لے کر آیا زوبیہ کو یا نہیں؟"

دادی نے پوچھا۔ پھوپھو نے دھیرے سے سر اٹھایا۔ طارق، وردہ اور طالب کا بڑا بھائی تھا اور زوبیہ اسکی بیوی تھی۔ انکی ایک دو سالہ بیٹی بھی تھی۔ دونوں میاں بیوی کی نہیں بنتی تھی اور اس میں بڑا ہاتھ وردہ اور ثریا چچی کا تھا۔

" کہاں اماں..."

ان کے چہرے پر ایسی بے بسی تھی کہ اگلے الفاظ خود ہی افسوس بن گئے۔

"وہ جاتا ہی نہیں ہے لینے۔ کہہ رہا ہے جس منہ سے گئی ہے، خود واپس آ جائے۔"

دادی نے چند لمحے انہیں دیکھا۔ "دو مہینے ہو گئے ہیں نا؟"

"ہاں۔"

"اور بچی؟"

"وہ بھی ماں کے ساتھ ہے۔"

دادی نے افسوس سے لب بھینچ لیے۔ "ایسے تو رشتہ ختم ہو جائے گا۔"

آصفہ پھوپھو نے ڈائری بند کر دی۔

" کچھ رشتے ختم ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں، اماں۔ ہم ان سے صرف اس لیے جڑے رہتے ہیں کیونکہ ہم نے انہیں چھوڑنے کا حق کبھی خود کو دیا ہی نہیں۔"

دادی نے گہری سانس لی۔

"میاں بیوی کا رشتہ اتنا آسان نہیں ہوتا آصفہ۔ لڑائی جھگڑا ہر گھر میں ہوتا ہے۔"

"لڑائی اور مار میں فرق ہوتا ہے۔"

آصفہ پھوپھو کا لہجہ نرم تھا، مگر بات واضح۔

"طارق نے اسے بہت مارا ہے۔"

"اور مارا کیوں تھا؟"

"شک کی بنیاد پر... اسے زوبیہ کے فون میں کچھ میسجز ملے تھے۔"

" کس کے؟"

"اس کے کزن کے۔"

دادی نے حیرت سے بھنویں اٹھائیں۔

" کزن؟"

"ہاں۔"

"تو پھر؟"

"طارق کو لگا وہ کسی غیر مرد سے بات کرتی ہے۔"

دادی نے کچھ لمحے سوچا۔"مرد کو غیرت بھی تو ہوتی ہے۔"

آصفہ پھوپھو نے فوراً ان کی طرف دیکھا۔"غیرت؟"

"ہاں، بیوی کسی غیر مرد سے بات کرے تو شوہر کو برا لگ سکتا ہے۔"دادی نے قدرے دفاعی انداز میں کہا۔

"برا لگنا حق ہے، اماں۔ مارنا حق نہیں۔"

دادی خاموش رہیں۔آصفہ پھوپھو نے اپنی انگلیاں ڈائری کے کنارے پر رکھ دیں۔

"غیرت کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنی بیوی کے فون کی تلاشی لیں، اس کے رشتے داروں سے بات کرنے پر اسے پیٹیں یا اس کی مرضی ختم کر دیں۔"

"لیکن اگر واقعی وہ غلط ہو؟"

"تو بات کرے۔سوال کرے۔ناراضی ظاہر کرے۔رشتہ ختم کرے۔مگر ہاتھ اٹھانے کا حق کسی کو نہیں مل جاتا۔" آصفہ پھوپھو کی آواز میں اب قدرے سختی تھی۔

"تو تمہیں کیا لگتا ہے کیا ہونا چاہیے؟"

"تو پھر رشتہ ختم کر دیں، اماں۔"

یہ جملہ بہت سادہ تھا۔ مگر دادی نے سنجیدگی سے سنا۔

"اتنی آسانی سے؟"

"ہاں۔ اگر رشتہ عزت، اعتماد اور سکون نہیں دے رہا تو اسے صرف اس لیے کیوں گھسیٹا جائے کہ لوگ کیا کہیں گے؟"

"لوگ باتیں بنائیں گے۔" دادی نے افسوس سے کہا۔ پھوپھو کے لبوں پر ایک بے رنگ سی مسکراہٹ آئی۔

"خاندان میں سب سے خطرناک جملہ 'لوگ باتیں بنائیں گے' ہوتا ہے۔ اس ایک جملے نے بہت سے لوگوں کو اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے نہیں دی۔" آصفہ پھوپھو کے چہرے پر ملال تھا۔ دادی نے گہری سانس لی۔

"لیکن بیٹی، گھر توڑنا بھی کوئی معمولی بات نہیں۔"

"گھر کون توڑتا ہے؟" آصفہ پھوپھو نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "وہ عورت جو دو مہینے سے اپنے میکے بیٹھی ہے؟ یا وہ مرد جس نے اپنی بیوی کو اتنا توڑا کہ وہ واپس آنے سے ڈر رہی ہے؟"

دادی کے پاس فوراً جواب نہیں بن پایا۔ پھوپھو نے بات جاری رکھی۔

"رشتے خون سے بنتے ہیں، لیکن قائم رویے سے رہتے ہیں۔ جب میاں بیوی کا رویہ ہی ایک دوسرے کے ساتھ ٹھیک نہ ہو تو پھر وہ رشتہ قائم رکھنے کا کیا فائدہ؟"

"مگر طارق اسے لینے کیوں نہیں جا رہا؟"

"انا ہے اماں۔ اسے لگتا ہے پہل کرنے سے وہ چھوٹا ہو جائے گا۔"

دادی نے سر ہلایا۔ "مرد کی خودداری بھی عجیب چیز ہے۔"

"انا اور خودداری الگ چیزیں ہیں، اماں۔ خودداری انسان کو غلطی سے روکتی ہے۔ انا انسان کو معافی مانگنے سے۔"

"رشتہ بڑا ہو تو اس کی عزت بھی بڑی ہوتی ہے۔" دادی نے ہاتھ لہرایا۔

"رشتہ بڑا ہونے سے اس میں موجود غلطی چھوٹی نہیں ہو جاتی۔" آصفہ پھوپھو نے افسوس سے مسکرا کر سر ہلایا۔ وہ ڈائری پر نگاہ ڈالنے لگیں۔
"اور شوہر ہونا کسی مرد کو بیوی کا مالک نہیں بنا دیتا۔"

"یہ باتیں آج کل کی لڑکیاں بہت کرتی ہیں۔" دادی کے لہجے میں ہلکی سی شکایت تھی۔

"کیونکہ آج کل کی لڑکیاں کچھ سوال پوچھنے لگی ہیں، اماں۔" پھوپھو مسکرا دیں۔

"کون سے سوال؟"

"یہ کہ اگر مرد کو غصہ آئے تو کیا عورت کو مارنا ضروری ہے؟ اگر اسے شک ہو تو کیا عورت کو ذلیل کرنا ضروری ہے؟ اگر رشتہ خراب ہو جائے تو کیا پوری عمر اسے گھسیٹنا اور طعنے دینا ضروری ہے؟"

دادی خاموشی سے سنتی رہیں۔

"اور سب سے بڑا سوال... کیا صرف اس لیے برداشت کرتے رہیں کہ خاندان کا نام خراب نہ ہو؟"

دادی نے بھنویں سکیڑ ڈائری کی طرف دیکھا۔ "تم طارق کے خلاف ہو؟"

"میں ظلم کے خلاف ہوں۔" جواب فوراً آیا۔ "طارق غلط ہے تو اس کے خلاف بھی ہوں۔ زوبیہ غلط ہے تو اس کے خلاف بھی۔ لیکن کسی کی غلطی دوسرے کو ظلم کرنے کا حق نہیں دیتی۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہیں۔ پھر دادی نے دھیرے سے پوچھا۔

"اگر زوبیہ واپس نہ آئی تو؟"

"وہ اپنے لیے صحیح فیصلہ کرے گی۔"

اسی لمحے ڈائننگ ہال سے نیمل کی آواز ابھری۔

"اماں! آصفہ پھوپھو! کھانا لگ گیا ہے۔"

دونوں آہستہ آہستہ ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ اور لاؤنج کی خاموشی میں آصفہ پھوپھو کی آخری بات دیر تک ٹھہری رہی۔ البتہ تارہ اور نوفہ کے مشترکہ کمرے سے چغلی خان اور تارہ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

☆...☆...☆

ڈائننگ ہال میں وہ ہجوم نہیں تھا جو صبح یا رات کو ہوتا تھا۔ گھر کے بڑے حصے میں ایک عجیب سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ سرمد صاحب آفس تھے، سلال اور نامرہ اپنے اپنے کالج، سقراط کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ سومیز کے گرد صرف نیمل، دادی، آصفہ پھوپھو، نوفہ اور تارہ رہ گئی تھیں۔ کھانے کی خوشبو پورے گھر میں پھیلی تھی، مگر کسی کے چہرے پر کھانے کی خواہش نہیں تھی۔ سب بیٹھنے ہی والے تھے کہ آصفہ پھوپھو نے اپنی گود میں رکھی ڈائری اٹھالی۔ انہوں نے چند لمحے اسے دیکھا، جیسے وہ ڈائری نہیں بلکہ اپنی زندگی کا کوئی ایسا باب ہو جسے کھولنے کی ہمت انہوں نے برسوں سے نہیں کی تھی۔ پھر وہ نیمل کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"نیمل یہ تمہارے لیے ہے۔"

نیمل نے حیرت سے ان کے ہاتھ میں موجود پرانی ڈائری دیکھی۔ سرورق وقت کے ہاتھوں مدھم پڑ چکا تھا۔ کناروں سے کاغذ ذرا سا زرد ہو گیا تھا اور جلد پر انگلیوں کے بے شمار لمس کے نشان تھے۔

"میری پرانی ڈائری ہے۔" آصفہ پھوپھو کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"جب مُجھے عربی اور فارسی کا شوق ہوا کرتا تھا، تب لکھا کرتی تھی۔"

ان کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی جو اگلے ہی لمحے آنکھوں میں ٹھہرے پانی کے سامنے دم توڑ گئی۔

"مُجھے لگتا ہے تمہیں پسند آئے گی۔"

نیمل نے پہلے ڈائری کو دیکھا اور پھر ان کی آنکھوں کو۔ وہی آنکھیں جن میں کبھی زندگی کے کتنے رنگ ہوا کرتے ہوں گے۔ وہی آنکھیں جو حق کو وراثت میں ملی تھیں۔ مگر آج ان میں نیلا رنگ بھی جیسے کہیں دور رہ گیا تھا۔ صرف تھکن تھی، اداسی تھی اور برسوں سے دبی ہوئی کوئی ایسی کہانی تھی جسے زبان نے کبھی بیان نہیں کیا تھا۔ نیمل نے ڈائری دونوں ہاتھوں سے تھام لی۔

"ضرور پڑھوں گی پھوپھو۔"

آصفہ پھوپو نے اثبات میں سر ہلایا۔ "آرام سے پڑھنا۔ اس میں بہت سی پرانی باتیں ہیں۔"

ان کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ نیمل نے ایک لمحے کے لیے ڈائری کو دوبارہ دیکھا۔
پھر وہ اسے لے کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ کمرے میں آ کر اس نے ڈائری میز پر رکھ دی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ باہر سے تارہ کی آواز آ رہی تھی جو نوفہ سے کسی بات پر بحث کر رہی تھی۔ دادی کبھی انہیں ڈانٹتیں، کبھی کھانے کی طرف متوجہ کرتیں۔ کچھ سوچتے ہوئے

نیمل نے ڈائری دوبارہ اٹھالی۔ پہلا صفحہ کھولا۔ یہ عام ڈائری نہیں تھی۔ یہ ایک جرنل تھا۔ صفحات پر تاریخیں درج تھیں۔ کہیں عربی کے جملے تھے، کہیں فارسی کے اشعار۔ بعض صفحات پر صرف ایک دو سطریں لکھی تھیں، جیسے لکھنے والے کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہو مگر الفاظ چند ہی میسر آئے ہوں۔ نیمل نے انگلی سے ایک پرانے صفحے کا کنارہ چھوا۔ کاغذ سے ہلکی سی پرانی خوشبو اٹھی۔ اس نے اگلا صفحہ پلٹا۔ فارسی میں چند سطریں لکھی تھیں۔ وہ مکمل طور پر سمجھ نہیں پائی، مگر الفاظ کی ترتیب میں ایسی نرمی تھی کہ وہ بے اختیار رک گئی۔ نیچے کوئی تاریخ نہیں تھی، صرف ایک چھوٹا سا نشان بنا ہوا تھا۔ نیمل نے اگلا صفحہ پلٹا۔ وہاں صرف ایک جملہ تھا۔

"عيونك تسطلني!"

نیمل کی بھنویں ذرا سی سکڑیں۔ اس نے دوبارہ پڑھا۔

"عيونك تسطلني!"

"تمہاری آنکھیں مُجھے پاگل کرتی ہیں۔"

نیمل کے ہاتھ رک گئے۔ یہ جملہ کسی عام نوٹ کی طرح نہیں لکھا گیا تھا۔ اس کے نیچے قلم کی سیاہی قدرے پھیلی ہوئی تھی، جیسے لکھنے والے کا ہاتھ ایک لمحے کو ٹھہرا ہو۔ نیمل نے بے اختیار صفحے پر انگلی رکھ دی۔ یہ کس کے لیے لکھا گیا تھا؟ اور کس نے لکھا تھا؟ اس سے پہلے کہ وہ اگلا صفحہ پلٹتی، باہر سے دادی کی آواز آئی۔

"نیمل!"

وہ چونکی۔ اس نے ڈائری کی طرف دوبارہ دیکھا۔ کچھ لمحے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس پرانی کتاب کے اندر کوئی ایسی بات چھپی ہو جو محض شاعری نہیں تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو جھڑکا۔ ڈائری بند کی، احتیاط سے اسے میز پر رکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ دروازہ بند ہوتے ہی میز پر پڑی وہ پرانی ڈائری خاموش رہ گئی۔ اس کے بند صفحات کے اندر ایک اور جملہ، ایک اور نام، اور ایک پوری کہانی ابھی نیند میں تھی۔

☆...☆...☆

کلینک کی سفید دیواروں پر لگی گھڑی کی سوئیاں جیسے ضرورت سے زیادہ واضح سنائی دے رہی تھیں۔ٹک...ٹک...ٹک...!نیمل ڈاکٹر کے سامنے بیٹھی تھی جبکہ نوفہ باہر انتظار گاہ میں تھی۔وہ اسے ہسپتال لاتے ہوئے پورے راستے خاموش رہی تھی۔راستے بھر نوفہ نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے مگر نیمل جانتی تھی کہ پندرہ سال کی عمر میں کوئی لڑکی اگر اپنے جسم میں آنے والی تبدیلیوں سے پریشان ہو اور پھر بھی بار بار کہے کہ میں ٹھیک ہوں تو عموماً وہ ٹھیک نہیں ہوتی۔ڈاکٹر نے سامنے رکھی نوفہ کی ہسٹری رپورٹ دوبارہ دیکھی۔نوفہ سے بات چیت کے بعد اب وہ نیمل سے اسکا کیا ڈسکس کر رہی تھیں۔

"سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتادوں کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔نوفہ کی حالت ایسی نہیں کہ اسے کوئی خطرناک بیماری سمجھا جائے بس اسکا وزن تیزی سے بڑھ رہا ہے۔"

"میں اسے صرف وزن بڑھنے کی وجہ سے نہیں لائی۔"نیمل نے آہستہ سے کہا۔

"اس کے چہرے پر بال پہلے سے زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔آنکھوں کے نیچے اتنے گہرے حلقے ہیں کہ جیسے کئی راتوں سے سوئی ہی نہیں۔ اور..."وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔"رات کو اسے نیند نہیں آتی۔کبھی دو بجے تک جاگتی رہتی ہے،کبھی تین بجے۔صبح اٹھتی ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے پوری رات سوئی ہی نہ ہو۔"

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔"یہ معلومات اہم ہیں۔"انہوں نے فائل میں کچھ لکھا۔"چہرے پر غیر معمولی بالوں کی افزائش،وزن میں تیزی سے تبدیلی،تھکن،نیند کا خراب ہونا اور آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے...یہ سب الگ الگ وجوہات سے بھی ہو سکتے ہیں اور بعض اوقات ایک ہی مسئلے سے بھی جڑے ہوتے ہیں۔"

"کس مسئلے سے؟"نیمل نے فوراً پوچھا۔

"ہارمونز کے عدم توازن سے ایک امکان ہو سکتا ہے۔لیکن ہمیں اندازہ نہیں لگانا چاہیے۔کچھ ہارمونل مسائل،تھائیرائڈ کی خرابی،انسولین سے متعلق مسائل،بعض غذائی کمیوں،مسلسل ذہنی دباؤ یا نیند کی خرابی بھی ایسی علامات پیدا کر سکتی ہے۔"

"اسے اتنا اسٹریس کیوں ہو رہا ہے؟ وہ ابھی صرف پندرہ سال کی ہے۔"

"یہی تو اصل بات ہے۔" ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔

"ہم اکثر سمجھتے ہیں کہ بچوں کو بڑے لوگوں جیسے مسائل نہیں ہوتے۔لیکن بچے بھی غم،خوف،گھر کے حالات،تعلیمی دباؤ،تنہائی،اپنے جسم کے بارے میں احساسِ کمتری اور مسلسل پریشانی سے گزر سکتے ہیں۔اور جب ذہنی دباؤ لمبا ہو جائے تو جسم بھی اس کا جواب دیتا ہے۔"

نیمل خاموش ہوگئی۔اسے معلوم تھا ڈاکٹر کس طرف اشارہ کر رہی ہے۔زہرہ بیگم کی موت کے بعد نوفہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔

"کیا اس کا وزن کم کرنا ضروری ہے؟"

"اس وقت ہمارا مقصد صرف وزن کم کرنا نہیں ہونا چاہیے۔"

"تو پھر؟"

"پہلے یہ دیکھنا ہے کہ وزن کیوں بڑھ رہا ہے۔"

"کیا نوفہ کو PCOS ہے؟"

"میں نے ایسا نہیں کہا۔" ڈاکٹر نے نرمی سے جواب دیا۔

"صرف وزن بڑھنے سے PCOS کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔اس عمر میں تشخیص خاص احتیاط سے کی جاتی ہے۔اسی لیے ہم نے جو ٹیسٹ ضروری تھے وہ لکھے ہیں۔رپورٹ آنے کے بعد تصویر زیادہ واضح ہوگی۔"

نیمل نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ڈاکٹر نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"پندرہ سال کی عمر میں بچی اپنے جسم کے بارے میں پہلے ہی بہت حساس ہوتی ہے۔ اگر ہم اسے بار بار وزن کا احساس دلائیں گے تو وہ کھانے سے خوفزدہ ہو سکتی ہے، خود کو دوسروں سے موازنہ کرنے لگ سکتی ہے، یا چھپ کر ایسے طریقے اختیار کر سکتی ہے جو اس کی صحت کے لیے زیادہ نقصان دہ ہوں۔"

نیمل نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"اسے بتائیں کہ آپ اس کی صحت کے لیے فکرمند ہیں۔ اس کے چہرے کے بال ہوں، آنکھوں کے حلقے ہوں، وزن ہو یا نیند...ان میں سے کوئی چیز اسے شرمندہ کرنے کی وجہ نہیں ہے۔ یہ چند علامات ہیں، اس کی شخصیت نہیں۔"

نیمل غور سے سنتی رہی۔

"اس کی نیند بہتر کریں۔ رات کو فون اور اسکرین کا استعمال کم کروائیں۔ دن میں کچھ جسمانی سرگرمی ہو۔ کھانا متوازن ہو۔ اور سب سے اہم..." ڈاکٹر نے ذرا توقف کیا۔
"اسے اپنے گھر میں دوبارہ محفوظ محسوس کروائیں۔"

"اور اگر وہ مجھ سے بات نہ کرے؟"

"تو اس کے ساتھ بیٹھیں۔" ڈاکٹر مسکرائیں۔ "ہر مسئلے کا حل بات کروانا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی صرف کسی کے پاس خاموش بیٹھنا بھی علاج کا حصہ ہوتا ہے۔"

نیمل نے آہستہ سے سانس خارج کی۔ "میں اسے بہتر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"تو اسے بہتر نظر آنے کے بجائے بہتر محسوس کرنے میں مدد کریں۔" ڈاکٹر کی آواز میں شفقت تھی۔ "وزن بعد میں دیکھ لیں گے۔ ابھی ہمیں

اس بچی کی نیند، ذہنی سکون اور مجموعی صحت دیکھنی ہے۔"

نیمل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور ایک بات یاد رکھیں۔ پندرہ سال کی بچی کو بالغوں کے مسائل کا بوجھ اٹھانے کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے۔ اگر گھر کے حالات نے اسے وقت سے پہلے بڑا کر دیا ہے تو اب گھر والوں کو مل کر اسے دوبارہ بچہ بننے کی جگہ دینی ہوگی۔"

نیمل نے فائل دونوں ہاتھوں سے تھام لی۔ "میں کوشش کروں گی۔"

"کوشش نہیں۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "اس کے ساتھ رہیں۔ باقی ہم دیکھ لیں گے۔"

نیمل نے اس بار قدرے اطمینان سے سر ہلایا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ باہر شیشے کے پار نوفہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے، نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ پندرہ برس کی عمر میں وہ اتنی خاموش لگ رہی تھی جیسے زندگی نے اس سے اس عمر کی ساری آواز چھین لی ہو۔ زہرہ بیگم کے جانے کے بعد اس گھر میں ہر بچہ اپنے اپنے طریقے سے یتیم ہوا تھا اور شاید نوفہ کا جسم اس خاموش غم کو سب سے پہلے بیان کر رہا تھا۔ نیمل نے دروازہ کھولا۔ نوفہ نے فوراً سر اٹھایا۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے؟"

نیمل نے اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے کچھ نہیں کہا۔ پھر آگے بڑھی، اس کے بالوں کو پیار سے پیچھے کیا اور دھیرے سے بولی۔

"کہا ہے تمہیں اپنی آپی کی ضرورت ہے۔"

نوفہ نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ کلینک سے واپسی پر شام ڈھلنے لگی تھی۔ سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا مگر آسمان پر سنہری روشنی مدھم پڑنے لگی تھی۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت معمول سے کم تھی۔ نیمل اسٹیئرنگ تھامے سامنے دیکھ رہی تھی جبکہ نوفہ خاموشی سے اس کے برابر والی نشست پر بیٹھی تھی۔ کچھ دیر سے نیمل جان بوجھ کر ہلکی پھلکی باتیں کر رہی تھی۔

"ویسے ڈاکٹر نے کہا ہے تمہیں روزانہ تھوڑی واک کرنی چاہیے۔"

نوفہ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بس ہمم کیا۔

"اور رات کو موبائل کم استعمال کرنا ہے۔"

اس بار نوفہ نے اسے دیکھا۔ "آپ بھی تو رات کو فون دیکھتی رہتی ہیں۔"

نیمل کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "میں بڑی ہوں۔"

"تو بڑی ہونے کا مطلب ہے نیند کی ضرورت نہیں رہی؟"

"بالکل۔"

نوفہ اس بار ہلکا سا مسکرائی۔ "جھوٹ۔"

"اچھا بھئی، میں بھی کوشش کروں گی۔"

نوفہ کی مسکراہٹ چند لمحوں بعد پھر مدھم پڑ گئی۔ نیمل نے اسے دیکھا۔

"اب اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم بیمار نہیں ہو۔ بس ہمیں اپنی صحت پر تھوڑی توجہ دینی ہے۔"

"آپ ناراض تو نہیں ہیں؟"

نیمل کے ہاتھ ایک لمحے کو اسٹیئرنگ پر ٹھہرے۔"تم سے؟"

نوفہ نے کندھے اچکا دیے۔"پتا نہیں۔"

نیمل نے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"تم میری بہن ہو۔تمہاری طبیعت خراب ہوگی تو میں فکر کروں گی، ناراض نہیں۔"

نوفہ نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔گاڑی آگے بڑھتی رہی۔عرب ٹاؤن کی حدود زیادہ دور نہیں تھیں۔اور پھر...ایک سیاہ گاڑی اچانک دائیں جانب سے آ کر ان کے برابر ہوئی۔
نیمل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی، دوسری گاڑی بائیں جانب آ کر رک گئی۔نوفہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"آپی..."

نیمل نے فوراً رفتار کم کی۔

"گھبراؤ نہیں۔"

لیکن اس کے اپنے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو چکی تھی۔دونوں گاڑیوں نے ان کی گاڑی کو اس طرح گھیر لیا تھا کہ آگے جانے کی جگہ بہت کم رہ گئی تھی۔گاڑی ٹھہر گئی۔

"آپی یہ کون لوگ ہیں؟"

"دیکھ لیتے ہیں..."

گاڑی کے دروازے لاکڈ تھے۔ چند سیکنڈ بعد سامنے والی گاڑی سے ایک آدمی اترا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ دونوں گاڑیوں سے مزید لوگ باہر نکل آئے اور چند ہی لمحوں میں ان کی گاڑی چاروں طرف سے گھری ہوئی تھی۔ نوفہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"آپی، یہ لوگ ہمیں..."

"نوفہ۔" نیمل نے سخت مگر پرسکون لہجے میں اسے روکا۔

"میری طرف دیکھو۔" نوفہ نے اس کی طرف دیکھا۔ "جب تک میں نہ کہوں، دروازہ نہیں کھولنا۔ ٹھیک ہے؟"

نوفہ نے جلدی سے سر ہلایا۔ وہ آدمی گاڑی کے قریب آیا۔ نیمل نے شیشہ نہیں اتارا۔ اس نے اپنا فون نکالا، کان سے لگایا اور نیمل کو بھی فون اٹھانے کا اشارہ کیا۔ نیمل چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے فون اٹھایا۔ اسی لمحے اسکرین پر وہی نمبر جگمگا اٹھا جس سے پچھلے کئی دنوں سے اسے کالز آ رہی تھیں۔ نیمل نے کال اٹھالی۔

"ہیلو؟"

باہر کھڑا آدمی بولا۔ "وکیل صاحبہ، ہمارے باس آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لائن پہ ہیں۔"

نیمل کی نگاہیں سامنے جم گئیں۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر دوسری طرف سے ایک بھاری، قدرے کھردری آواز ابھری۔

"وکیل صاحبہ..." نیمل نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔

"بولیں۔"

"نام گوگا ہے میرا جی..."

"تو میں کیا کروں؟" نوفہ نے بے اختیار نیمل کو دیکھا۔ گوگا نے فوراً کہا۔

"آپ سے پہلے بھی کہا ہے...میرا کیس لڑیں۔"

"یعنی میں ایک غنڈے کو جیل سے باہر نکلواؤں؟" نیمل کا لہجہ سپاٹ تھا۔ دوسری طرف چند لمحوں کی خاموشی ہوئی۔ پھر گوگا ہنس دیا۔

"غنڈہ ہوں، موالی ہوں...لیکن قاتل نہیں ہوں جی..."

نیمل کی نگاہ ایک لمحے کے لیے سامنے کھڑے آدمی پر گئی۔ "جانتی ہوں۔"

دوسری طرف جیسے سانس ساکت ہوا۔ "کک...کیا مطلب؟"

"تمہاری یہ حرکت دیکھ کر پتا چل گیا ہے کہ تم جیل میں کیوں ہو۔ بے وقوف آدمی!"

نیمل کے لہجے میں عجیب سا سکون تھا۔ باہر کھڑے آدمی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گوگا بھی چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس کی آواز پہلے سے سنجیدہ تھی۔

"آپ وکیل ہیں جی۔ آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ ہر ملزم قاتل نہیں ہوتا۔"

"اور ہر وکیل کسی بھی ملزم کا مقدمہ نہیں لڑتا۔"

"آپ نے میرا کیس پڑھا بھی نہیں۔"

"اسکی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جو آدمی وکیل کو منانے کے لیے اس کی گاڑی گھیر لے، وہ مُجھے عدالت میں بے گناہی کی دلیل دینے سے پہلے اپنے دماغ کا علاج کرواتا نظر آئے گا۔"

نوفہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کی، مگر خوف ابھی بھی اس کے چہرے پر تھا دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر گوگا کی ہنسی سنائی دی۔

"آپ خطرناک عورت ہیں، وکیل صاحبہ!"

"اور تم بہت فضول آدمی ہو۔"

"اچھا، ایک بات بتاؤں؟"

"نہیں..."

"پھر بھی بتاتا ہوں۔"

نیمل نے بے زاری سے آنکھیں گھمائیں۔

"آج آپ میری مدد کریں گی..." گوگا کا لہجہ بدل گیا۔

"کل کو میں آپ کی مدد کروں گا۔"

نیمل کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

"مُجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔"

"آج نہیں ہے۔ کل ہو سکتی ہے۔ دنیا بڑی خراب جگہ ہے، وکیل صاحبہ۔ کبھی کبھی شریف لوگوں کو بھی ہم جیسے لوگوں کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

"اور کبھی کبھی ہم جیسے لوگوں کو تم جیسے لوگوں سے دور رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔" گوگا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "لیکن آپ نے ابھی تک فون نہیں کاٹا۔"

نیمل چند لمحے خاموش رہی۔

" کیونکہ مُجھے جاننا ہے تم چاہتے کیا ہو؟ میں نے اگر فون کاٹ دیا تو تمہارے لوگ مُجھے یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔"

"بس اتنا کہ میرا کیس آپ دیکھ لیں۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں؟"

"تو میں دوبارہ فون کروں گا۔"

"اور اگر پھر بھی انکار کیا؟"

"تو شاید دوبارہ گاڑی گھیرنی پڑے اور کیا پتا گھر کو بھی..."

نیمل کی آنکھیں سخت ہو گئیں۔" گوگا۔"

"جی وکیل صاحبہ!"

"میری بہن میرے ساتھ ہے اور تم نے اسے ڈرایا ہے۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ پھر گوگا کی آواز آئی۔

"معذرت جی۔"

یہ لفظ اس قدر سادہ تھا کہ نیمل ایک لمحے کے لیے خاموش رہ گئی۔

"اب راستہ دو۔"

"دے دیا۔"

نیمل نے سامنے دیکھا۔ واقعی دونوں گاڑیوں میں سے ایک پیچھے ہٹ چکی تھی۔ گوگا نے آخری بار پھر کہا۔

"وکیل صاحبہ... کیس دیکھ لیں۔"

نیمل نے جواب نہیں دیا۔ فون کاٹ دیا۔ اس نے فوراً گاڑی آگے بڑھائی۔ مگر دونوں گاڑیاں بھی ان کے ساتھ چل پڑیں۔ نوفہ کا چہرہ پھر زرد پڑ گیا۔

"آپی..."

نیمل نے کچھ نہیں کہا۔ وہ چند منٹ خاموشی سے گاڑی چلاتی رہی۔ یہ تو اسے پتا چل گیا تھا گوگا عام آدمی نہیں تھا۔ جیل میں ہوتے ہوئے وہ اس سے فون پہ بات کر سکتا تھا تو کیس ضرور پیچیدہ ہوگا۔ اسی اثناء میں عرب ٹاؤن کا گیٹ سامنے آ گیا۔ اور عین گیٹ پر دونوں گاڑیاں ایک طرف رک گئیں۔ ان لوگوں نے راستہ کھول دیا۔ نیمل نے رفتار بڑھائی۔ ریئر ویو مرر میں دیکھا تو دونوں گاڑیاں وہیں کھڑی تھیں۔ نوفہ نے ایک لمبی سانس خارج کی۔

"یہ لوگ ہمیں مارنے آئے تھے؟"

نیمل نے سڑک پر نظریں جمائے رکھیں۔ "نہیں۔"

"پھر؟" نیمل نے چند لمحے سوچا۔

"وہ مُجھے ڈرانے آئے تھے۔"

"ڈرا تو دیا۔" نوفہ نے زرد چہرے کے ساتھ کہا۔

"مُجھے نہیں۔" نیمل نے نوفہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "صرف تمہیں..." نوفہ خاموش ہوگئی۔

گاڑی شبگیر کی طرف بڑھتی رہی مگر نیمل کے ذہن میں گوگا کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"آج آپ میری مدد کریں گی..کل کو میں آپ کی مدد کروں گا۔"

☆...☆...☆

چند دن گزر چکے تھے مگر سرمد صاحب کے اندر وہ طوفان ابھی تک تھما نہیں تھا۔ وقت نے زہرہ بیگم کی موت کا صدمہ بھی ان کے دل پر بٹھا دیا تھا اور نیمل کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا غصہ بھی۔ فیکٹری کے وسیع دفتر میں معمول کے مطابق مشینوں کی مسلسل گونج اور ملازمین کی آمد و رفت جاری تھی، مگر سرمد صاحب کے لیے جیسے سب کچھ بے معنی ہو چکا تھا۔ سرمد صاحب نے سلطان احمد کو برسوں دوست سمجھ کر اس کے اثر و رسوخ پر کبھی انگلی نہیں اٹھائی تھی مگر اب انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھا آدمی جب ذاتی دشمنی پر اتر آئے تو اسے روکنے کے لیے صرف شرافت کافی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی اپنی اولاد کو بچانے کے لیے باپ کو وہ راستہ بھی اختیار کرنا پڑتا ہے جہاں انگلی سیدھی رکھنے کے بجائے ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے۔ آج سرمد صاحب اسی راستے کا پہلا قدم اٹھانے والے تھے۔ کیونکہ خاموش رہنا بھی کبھی کبھی بزدلی بن جاتا ہے۔ وہ اپنی بیٹیوں کے لیے برسوں سے مضبوط بن کر کھڑے رہے تھے۔ کاروبار میں نقصان آیا، سنبھالا۔ لوگوں نے پیٹھ پیچھے باتیں کیں، نظر انداز کیا۔ مگر نیمل کے ساتھ جو ہوا تھا، اس نے ان کے اندر کے باپ کو زخمی کر دیا تھا۔ اور زخمی باپ ہمیشہ حساب رکھتا

ہے۔

چند ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی پھر دروازہ کھلا اور طالب اندر داخل ہوا۔ وہ سیدھا ان کی میز کے سامنے موجود کرسی پر آ بیٹھا۔ سانولی رنگت، سادہ لباس، ہاتھ میں چمڑے کی فائل اور آنکھوں میں وہ مخصوص چمک جو کسی خبر کے پیچھے چھپی خبر کو ڈھونڈنے والوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ سرمد صاحب نے اسے چند لمحے خاموشی سے دیکھا۔

"تمہیں اندازہ ہے میں نے تمہیں اس وقت کیوں بلایا ہے؟"

"اندازہ ہے تایا جان۔"

"کیا؟"

"نیمل نے شاہ زیب کو خلع کے کاغذات بھجوا دیے ہیں۔"

"خلع کے کاغذات بھیجنے سے خلع نہیں ہو جاتی۔"

"جی۔" طالب نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اور شاہ زیب خلع بھی نہیں دینا چاہتا۔"

سرمد صاحب کے جبڑے بھنچ گئے۔ "وہ طلاق نہیں چاہتا کیونکہ اسے اپنی بیوی نہیں چاہیے۔ اسے اپنی جیت چاہیے۔"

طالب کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آئی۔ "اور جیتنے کے لیے وہ نیمل کو مزید ذلیل کرے گا۔" اس نے میز پر رکھی فائل کھولی۔

"وہ چاہتا ہے معاملہ عدالتوں میں گھسیٹے، خاندان کو بدنام کرے، اور سب سے بڑھ کر یہ ثابت کرے کہ غلطی نیمل کی تھی۔ وہ خلع نہیں دے گا تاکہ وہ خود کو مظلوم ظاہر کرتا رہے۔"

سرمد صاحب نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ فیکٹری کے دوسرے حصے سے مصالحوں کی تیز خوشبو ہوا کے ساتھ اندر آ رہی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں انہوں نے اپنی زندگی بنائی تھی۔ مگر آج انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اپنی اولاد کے لیے انہیں ایک بالکل دوسری جنگ لڑنی پڑے گی۔

"طالب۔"

"جی؟"

"سلطان احمد کو کتنا جانتے ہو؟"

طالب کی آنکھوں میں فوراً سنجیدگی اتر آئی۔ "انہیں کون نہیں جانتا؟"

"میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" سرمد صاحب نے کرسی سے پشت لگا لی۔ "اتنا اچھا کہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا وہ میرے گھر کے خلاف کھڑا ہو سکتا ہے۔"

طالب خاموش رہا۔

"لیکن اس نے ایک غلطی کی ہے۔"

"کیا؟"

طالب نے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اس نے مُجھے بہت قریب آنے دیا۔"

طالب کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آئی۔ "تو اب آپ اس قربت کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں؟"

"فائدہ نہیں۔" سرمد صاحب کی آواز بھاری ہوگئی۔ "حساب۔"

طالب نے فائل بند کر کر دی۔

"مسئلہ یہ ہے تایا جان کہ اخبار اور ٹی وی چینلز اتنی جلدی سلطان احمد کے خلاف کچھ نہیں بولیں گے۔ اس کی پوزیشن مضبوط ہے۔ بیوروکریسی میں تعلقات ہیں، میڈیا میں جان پہچان ہے۔ بغیر ثبوت کے کوئی ادارہ اپنی گردن نہیں پھنسائے گا۔"

"مُجھے خبر نہیں چاہیے طالب۔" سرمد صاحب آہستہ سے بولے۔ "مُجھے سچ چاہیے۔"

"اور اگر سچ کافی نہ ہوا؟" طالب کی پیشانی پہ بل پڑے۔

"تو پھر سچ کو اتنی آواز دینی ہوگی کہ اسے دبانا مشکل ہو جائے۔"

طالب چند لمحے انہیں دیکھتا رہا۔

"آپ جانتے ہیں نا، اس کھیل میں صرف پیسہ نہیں لگتا؟"

"مُجھے پتا ہے۔"

"نام بھی لگتا ہے۔ تعلقات بھی۔ اور اگر معاملہ الٹا پڑا تو آپ کے کاروبار کو بھی نقصان ہو سکتا ہے۔" طالب نے سنجیدگی سے کہا۔

"میری بیٹی کی عزت کے سامنے میری فیکٹری کیا چیز ہے؟"

الفاظ بہت سادہ تھے۔ مگر ان میں ایک باپ کا فیصلہ تھا۔ طالب نے پل بھر کو نظریں جھکا لیں۔ اسکے چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات

ابھرے۔

"میں لکھ دوں گا۔"

سرمد صاحب نے اسے دیکھا۔"ڈر نہیں لگے گا؟"

طالب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"مُجھے لکھنے سے ڈر نہیں لگتا، تایا جان۔"وہ ذرا آگے جھکا۔

"ہاں، یہ ضرور ہے کہ ہر لفظ سوچ سمجھ کر لکھنا پڑے گا۔الزام اور حقیقت کے درمیان ایک لکیر ہوتی ہے۔اسے پار کیا تو پوری کہانی ہمارے خلاف جا سکتی ہے۔"

"تو لکیر کے اندر رہ کر لکھو۔"سرمد صاحب نے فوراً جواب دیا۔" مگر اتنا ضرور لکھو کہ جن لوگوں نے اپنی طاقت کو ڈھال سمجھ رکھا ہے، انہیں اپنی اوقات یاد آئے۔"

" کچھ لوگوں کو واقعی اوقات یاد دلانا ضروری ہے۔"طالب کی آنکھوں میں سختی سی ابھری۔

"تو پھر شروع کرو۔"سرمد صاحب تیار بیٹھے تھے۔

طالب نے گہری سانس لی۔"پہلا کالم کب؟"

"جتنی جلدی ممکن ہو۔"

"موضوع؟"

"شاہ زیب سے شروع کرو۔"

طالب نے قلم انگلیوں کے درمیان گھمایا۔

"اور سلطان احمد؟"

سرمد صاحب چند لمحے خاموش رہے۔ پھر میز پر پڑی ایک فائل اٹھا کر طالب کی جانب سرکا دی۔

"اسے آخر میں لانا۔"

طالب نے فائل کی طرف دیکھا۔ "کیوں؟"

سرمد صاحب کے لبوں پر بے حد سرد مسکراہٹ آئی۔

"کیونکہ اگر شکار کو پہلے ہی بتا دیا جائے کہ شکاری کہاں کھڑا ہے تو وہ بھاگ جاتا ہے۔"

طالب نے فائل دوبارہ کھولی۔ "آپ نے کچھ نکلوایا ہے؟"

"میں نے صرف وہ چیزیں جمع کی ہیں جو پہلے سے موجود تھیں۔"

"اور اگر ان میں سے کچھ بہت پرانی ہو؟"

"سچ پرانا ہو سکتا ہے، جھوٹا نہیں ہو جاتا۔"

طالب نے پہلی چند دستاویزات پر نظر دوڑائی۔ کمرے میں چند لمحوں کے لیے صرف فیکٹری کی مشینوں کی مدھم آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر طالب نے نظریں اٹھائیں۔

"ایک مسئلہ اور ہے۔"

"کیا؟"

"مدیرِ اعلیٰ۔"

سرمد صاحب سمجھ گئے۔

"کتنا لگے گا؟"

طالب ایک لمحے کو خاموش رہا، جیسے رقم بتاتے ہوئے بھی جھجک ہو رہی ہو۔

"خبر کی نوعیت اور آدمی کی حیثیت دیکھتے ہوئے..."

"طالب۔" سرمد صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "قیمت پوچھو۔"

طالب نے ان کی طرف دیکھا۔

"آپ واقعی یہ کرنے جا رہے ہیں؟"

سرمد صاحب نے دراز کھولی۔

"میں نے اپنی بیٹی کو دنیا کے سامنے ذلیل ہوتے دیکھا ہے۔ قیمت تو چکانی ہوگی۔" انہوں نے دراز سے نوٹوں کی چند موٹی گڈیاں نکالیں اور میز پر رکھ دی۔

"یہ ایڈوانس ہے۔"

طالب کی نگاہ چند لمحوں تک نوٹوں پر رہی۔

"باقی...جتنا لگے، بتانا۔" سرمد صاحب نے گڈیاں اس کی جانب سرکا دیں۔ " مگر ایک بات یاد رکھنا۔"

طالب نے سر اٹھایا۔

"ہم جھوٹ نہیں خرید رہے۔" سرمد صاحب کی آواز اب پہلے سے زیادہ پُرسکون تھی۔ "ہمیں صرف اتنی جگہ خریدنی ہے جہاں سچ بولنے کی اجازت ہو۔"

طالب نے آہستہ سے رقم اٹھائی۔ اس کے چہرے پر اب صحافی کی بے قراری نہیں تھی۔ وہ کسی ایسے شخص کا چہرہ تھا جسے معلوم ہو کہ آج سے ایک کہانی شروع ہونے والی ہے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"پھر دیکھتے ہیں سلطان احمد صاحب کی بیوروکریسی کتنی بڑی ہے...اور اخبار کی ایک سچی سرخی کتنی۔"

سرمد صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ طالب دروازے تک پہنچا تو پیچھے سے ان کی آواز آئی۔

"طالب۔"

وہ رک گیا۔سرمد صاحب نے اسے دیکھا۔

"نیمل کو اس سب کا ابھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

"سمجھ گیا۔" طالب نے سر ہلا دیا اور باہر نکل گیا۔

دروازہ بند ہوا تو سرمد صاحب اپنی جگہ بیٹھے رہے۔کچھ لمحوں بعد انہوں نے دراز میں رکھی کی ایک تصویر اٹھائی۔یہ انکی پوری فیملی کی تصویر تھی۔ نیمل تصویر میں مسکرا رہی تھی۔سرمد صاحب کی انگلیاں تصویر کے کنارے پر رک گئیں۔

"باپ ہوں تمہارا، نیمل..." ان کی آواز بہت مدھم تھی۔

"تمہارے لیے انگلی تو کیا ہاتھ بھی ٹیڑھا کر دوں گا۔"

باہر فیکٹری اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔مشینیں گھوم رہی تھیں۔مصالحوں کی خوشبو پھیل رہی تھی۔اور ایک باپ، جسے ابھی تک لوگ صرف ایک کاروباری آدمی سمجھتے تھے، میدان میں اتر چکا تھا۔

☆...☆...☆

جاری ہے۔

(یہ قسط آپ لوگوں کے ساتھ شیئر کرتے ہوئے مُجھے بہت دکھ اور افسوس ہو رہا ہے کیونکہ اس قسط کا سب سے اہم اور آخری حصہ اس میں شامل نہیں ہو سکا۔پچاس صفحات کی فائل ڈرافٹ پڑی ہے اور میں اسے مکمل نہیں کر پائی کیونکہ پچھلے دس دنوں سے میکسی (My cat) کی بیماری میں مجھ سے کچھ ہوا ہی نہیں۔بہت کوشش کی لیکن پریشانی میں کام نہیں کر پائی۔آج قسط پبلش کرنے کا وعدہ تھا اس لیے پبلش کی جا رہی ہے۔میکسی اب اللہ کو پیارا ہو چکا ہے اور میرے لیے بہت مشکل وقت ہے۔میں نہیں جانتی مُجھے اگلا باب لکھنے میں کتنا وقت لگے گا لیکن مُجھے امید ہے آپ سب مُجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔جزاک اللہ)